تعلیم و تربیت

فروری
2010

عید میلادُ النبی ﷺ مبارک

میں ہوں اسکاؤٹ، ہے میرا کام خدمت دوستو

نظم صفحہ 6 پر

ضیاء الحسن ضیاء

SANIPLAST
First Aid Bandage

"Junior hamesha pass"

Junior

Pingo

'In everyday activities children get minor cuts, bruises, & abrasions. SANIPLAST protects the minor wounds from infection, germs, & bacteria, and helps them heal the natural way.'

iferoz

تعلیم و تربیت

عروج

بچوں کا محبوب رسالہ

فروری 2010ء

69واں سال دسواں شمارہ

(رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی)

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	1
درسِ قرآن وحدیث	سید مقبول حسین شاہ	2
نعت	ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی	3
پیارے نبیؐ کی۔۔۔	حمزہ خان	4
اسکاؤٹ	ضیاء الحسن ضیاء	6
تلاش	نذیر انبالوی	7
ویب سائٹ	غلام حسین میمن	11
پھر یوں ہوا	محمد فاروق انجم	13
دلچسپ علمی آزمائش	ذہین قارئین	17
آپ بھی لکھئے	ہونہار ادیب	19
سہیل عباس	نسرین شاہین	22
یہ ہے بچوں کی دُنیا	وقار محسن	25
خواب سے تعبیر تک	علی اکمل تصور	28
قلعہ روہتاس	محمد علی	32
یہ تو میرے چوزے۔۔۔	مجیب ظفر انوار	36
بھیجا	محمد فہیم عالم	40
شکار ہوا وُشوار	محمد عارف عثمان	43
آپ کا خط ملا	ننھے قارئین	48
امتحان	محمد فاروق دانش	51
جہنم تھا وہ جزیرہ	ثریا اختر	57
میں ہوں فسٹ۔۔۔	نعیم شاہد	61
ہونہار مصور	ننھے مصور	62
میری زندگی کے۔۔۔	پُر عزم قارئین	63
بلا عنوان	ننھے خوشہ چیں	64

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: "اسکاؤٹ"

قیمت فی پرچہ 25 روپے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو! فروری کے آخر میں ربیع الاوّل کا بابرکت مہینہ ہو گا۔ اس مہینے کی 12 تاریخ کو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دُنیا میں تشریف لائے تھے۔ اِس مبارک دن کا تقاضا ہے کہ ہم آپؐ کے نقشِ قدم پر چلیں اور تعلیماتِ نبویؐ پر مکمل طور پر عمل پیرا ہوں۔ ہماری طرف سے عید میلاد النبیؐ کی مبارک باد قبول کریں۔

5 فروری کو مقبوضہ کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے لیے "یومِ کشمیر" منایا جاتا ہے۔ کشمیری 60 سال سے آزادی کی خاطر نسل در نسل قربانیاں دے رہے ہیں۔ اب وہ دن زیادہ دُور نہیں جب کشمیر میں آزادی اور امن وسلامتی کا سورج طلوع ہو گا۔

آپ سب نے سلسلہ "مفید مشغلے" بے حد پسند کیا ہے۔ یہ پڑھ کر آپ کو یقیناً خوشی ہو گی کہ آئندہ شمارے سے ہم ایک نیا معلوماتی اور دل چسپی سے بھرپور سلسلہ "بچوں کا انسائیکلو پیڈیا" کا آغاز کر رہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ یہ سلسلہ بھی آپ کو بہت پسند آئے گا۔

آپ کے سالانہ امتحان بہت قریب ہیں، اپنی تمام تر توجہ امتحان کی تیاری پر مرکوز کریں، ہم آپ کی کام یابی کے لیے دُعا گو ہیں۔

اب آپ اِس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء وتجاویز سے آگاہ کیجئے۔

آپ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔ فی امان اللہ (مدیر)

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	مشیر خاص	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبدالسلام	ظہیر سلام	سید مقبول حسین شاہ	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم وتربیت" 32 ایبٹ روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309_36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے۔

ایشیاء، افریکا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

تعلیم وتربیت 32۔ ایبٹ روڈ، لاہور
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
Email: tot.tarbiatfs@gmail.com
tot.tarbiatfs@live.com

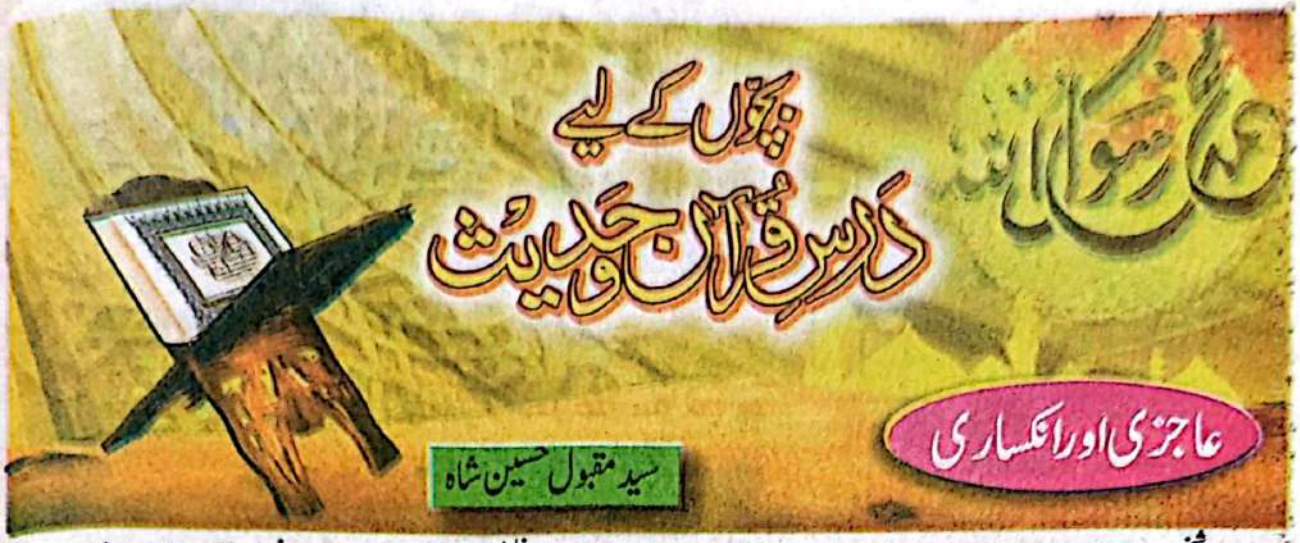

جو شخص عاجزی اور انکساری سے کام لیتا ہے، اپنی بڑائیاں بیان نہیں کرتا، نہ شیخی بگھارتا ہے، اُس کو لوگ اچھا سمجھتے ہیں اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ جو بات بھی کہتا ہے لوگ اُس کو سچ سمجھتے ہیں۔

مدینہ شریف میں مسجدِ نبویؐ میں جس جگہ رسولِ کریمؐ کا روضہ اقدس ہے۔ اُس جگہ آپؐ کا حجرہ یعنی گھر تھا۔ اُس کے باہر جو جگہ ریاض الجنہ یعنی جنت کا باغ کہلاتی ہے، وہاں پر کافروں کے غیر ملکی وفود آکر بیٹھتے تھے اور دین کے بارے میں رسولِ کریمؐ کی شفقت آمیز پیاری پیاری باتیں سنتے تھے۔

رسولِ کریمؐ بڑی نرمی سے، سادگی سے اور بڑے شگفتہ انداز میں اُن سے بات کرتے تھے، جو اُن کے دل میں اُترتی تھی اور اُن کا دل گواہی دیتا تھا کہ آپؐ جو بات فرما رہے ہیں وہ سچ ہے۔ چنانچہ وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔ چونکہ وہاں پر کافر بحیثیت جہنمی آکر بیٹھتے تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد بحیثیت جنتی وہاں سے اُٹھتے تھے، اِس لئے اُس جگہ کو ریاض الجنہ یعنی جنت کا باغ کہا گیا۔ قرآن مجید ہمیں عاجزی اور انکساری کا درس دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

سورۂ فرقان آیت ۶۳: "اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر (عاجزی اور انکساری سے) آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ اُن سے (کوئی غلط) بات کرتے ہیں تو (سختی سے جواب دینے کی بجائے نرمی سے) سلام کہتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کی اِن ہدایات پر اگر عمل کیا جائے تو کبھی کسی سے لڑنے جھگڑنے کی نوبت نہ آئے۔ دُوسرے کو سمجھانے کے لیے آپ عاجزی، انکساری اور بڑی نرمی سے بات کریں۔ اگر دُوسرا غلطی پر ہونے کے باوجود نہیں سمجھتا تو آپ اُس سے نہ بحث کریں، نہ لڑیں جھگڑیں۔ آپ سلام کہہ کر اُس سے الگ ہو جائیں۔ مومن وہ شخص کہلا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی باتوں پر کامل ایمان رکھتا ہے اور اُن پر عمل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عاجزی اور انکساری اختیار کرنے کی جو نصیحت کی ہے اُس پر ہمارا کامل ایمان ہونا چاہیے اور اُس پر عمل کرنا چاہیے۔

صحیح حدیث میں ہے: رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ "مومن کی مثال کھیت کے نرم ونازک پودوں کی سی ہے کہ ہوا چلتی ہے تو وہ جُھک جاتے ہیں، اِسی طرح مومن جب (اکڑتے ہوئے) سیدھا ہوتا ہے تو (اللہ کی طرف سے اُس پر) مصیبت آتی ہے جو اُسے جھکا دیتی ہے۔"

صحابہ کرامؓ نے اِس نصیحت پر عمل کیا۔ چنانچہ اُن کی زندگیاں عاجزی اور انکساری کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ حضرت عمرؓ جب خلیفہ تھے تو ایک شخص نے اُن سے کہا کہ آپ میں یہ یہ خامیاں ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ غصے میں نہیں آئے بلکہ بڑی عاجزی اور انکساری سے کہا کہ یہ خامیاں تو وہ ہیں جن کا آپ کو علم ہے۔ اِن کے علاوہ پتا نہیں مجھ میں اور کیا کیا خامیاں ہوں گی۔ آپ کی اِس عاجزی اور انکساری کا اُس شخص پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ رو پڑا اور پکار اٹھا کہ اے امیر المومنین! آپ میں کوئی خامی نہیں۔ اعلیٰ کردار، حسنِ اخلاق اور عاجزی وانکساری کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام بڑی تیزی سے دُنیا میں پھیلتا چلا گیا۔

پیارے بچو! آیئے عہد کریں کے ہم اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ عاجزی اور انکساری سے کام لیں گے اور لڑنے جھگڑنے یا غرور اور تکبر کرنے سے اجتناب کریں گے۔ آمین۔

نعت

خلقت میں ہیں سب سے بالا پاک محمدؐ
رب بھی ہمارا جن پہ شیدا پاک محمدؐ

رب نے اُن کو عرش پہ اپنے پاس بلایا
اپنا پیارا پیارا نوری جلوہ دکھایا

اپنی اُمت کی خاطر وہ لائے قرآں
جس کے اندر سب کی ہدایت کے ہیں فرماں

قرآں کی تعلیم ہے ، ہم بن جائیں نیک
جھگڑا چھوڑیں ، آپس میں ہو جائیں ایک

پاک نبیؐ کا کہنا جو بھی مانے گا
اُس کو جگ میں ہر اک اچھا جانے گا

خلقت: مخلوق، لوگ
بالا: اونچا، بلند
شیدا: عاشق، عشق میں ڈوبا ہوا۔ فدا
عرش: آسمان
جگ: دُنیا

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی (لاہور)

12 ربیع الاول کے مبارک موقع پر ایک عمدہ تحریر

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری عادات

حمزہ خان (پشاور)

☆ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔

☆ آپؐ دُوسروں سے ملاقات کے وقت ہمیشہ سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔ بڑی محبت اور پیار کے ساتھ "السلام علیکم رحمتہ اللہ" کہتے اور نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے تھے۔

☆ پیارے نبیؐ کبھی زور سے یا قہقہہ مار کر نہیں ہنستے تھے بلکہ خوشی کے موقع پر صرف مسکرا دیتے تھے۔ خوشی کے وقت آپؐ اکثر نظر نیچی کر لیتے تھے۔ کوئی خوشی کی خبر سنتے یا کسی بات پر مسرت محسوس کرتے تو آپؐ کا چہرہ مبارک چودھویں کے چاند کی طرح دمکنے لگتا تھا۔

☆ حضورؐ کبھی کسی کی طرف ناگواری اور ناپسندیدگی سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ نہایت شفقت اور رحمت کی نظر فرماتے تھے۔

☆ آپ رات کا تقریباً آخری نصف حصہ عبادت میں گزارتے تھے۔ صبح سویرے اٹھنا آپؐ کے نزدیک خیر و برکت کا باعث ہے۔

☆ صبح کی سیر آپؐ کو بہت پسند تھی۔ آپؐ سبزہ و ہریالی اور خاص طور پر باغات کو بہت پسند فرماتے تھے اور اکثر سیر کی غرض سے باغات میں تشریف لے جاتے تھے۔

☆ حضورؐ نہایت باقاعدگی کے ساتھ مسواک فرمایا کرتے تھے۔ مسواک کرنا آپؐ کو اتنا پسند تھا کہ ہر وقت مسواک اپنے پاس رکھتے تھے۔

☆ ہمارے آقاؐ جلدی جلدی یا تیزی سے باتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ آپؐ ہمیشہ آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر اِس طرح گفت گو کرتے تھے کہ سننے والا اچھی طرح آپؐ کی بات سمجھ لیتا تھا، بلکہ سننے والے کو آپؐ کی بات خوب یاد ہو جاتی تھی۔ عام طور پر زیادہ ضروری بات کو آپؐ تین بار دہرایا کرتے تھے۔

☆ آپؐ کو اگر کوئی راستے میں ملتا اور آپؐ سے بات چیت شروع کر دیتا تو آپؐ بڑی توجہ اور دلچسپی سے اس کی بات سنتے اور جب تک وہ خود رخصت نہ ہو جاتا آپؐ وہاں سے نہ ہلتے۔

☆ راستے میں حضورؐ کو بچے مل جاتے تو پہلے خود ان کو سلام کرتے، اُن کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور نہایت پیار سے باتیں کرتے۔

☆ آپؐ کی ایک پیاری عادت یہ بھی تھی کہ جب بھی سفر سے واپس تشریف لاتے تو گھر میں سب سے پہلے بچوں سے ملتے، انہیں پیار کرتے اور اُن سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے۔

☆ مجلس میں بیٹھ کر کسی کے بارے میں کانا پھوسی یا اشاروں سے بات کرنا آپؐ بہت برا سمجھتے تھے۔ کوئی بات کر رہا ہوتا تو آپؐ ہرگز اُس کی بات نہ کاٹتے بلکہ دُوسروں کی پوری بات سن کر مختصر اور نہایت

موزوں جواب عطا فرماتے تھے۔

☆ آپ کو اچھی اور مفید باتیں کرنا اور سننا پسند تھا۔ آپؐ کی محفل میں کبھی کبھی ہنسی مزاح کی باتیں بھی ہوا کرتی تھیں، مگر وہ سب نہایت عمدہ اور پاکیزہ قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔

☆ آپؐ ہمیشہ اپنے سر کے بالوں اور داڑھی میں کنگھی کیا کرتے تھے۔ گندے اور بکھرے ہوئے بال آپ کو سخت ناپسند تھے بلکہ آپؐ اپنے ساتھیوں کو صفائی ستھرائی اور بال بنانے، کنگھی کرنے اور مانگ نکالنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ صفائی آپ کو بہت عزیز تھی۔ اپنی صفائی کا خیال نہ رکھنے والے، گندہ رہنے اور میلے کچیلے کپڑے پہننے والے لوگوں کو آپؐ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ آپؐ کی یہ پیاری عادت تھی کہ آپؐ کے کپڑے چاہیے کتنے ہی پرانے اور پیوند لگے کیوں نہ ہوں، صاف ستھرے ضرور ہوتے تھے۔ آپؐ بڑی باقاعدگی کے ساتھ غسل فرمایا کرتے تھے۔ بال اور ناخن کتراتے، آنکھوں میں سرمہ لگاتے، بالوں میں تیل لگاتے اور کنگھی کیا کرتے تھے۔ خوش بو لگانا بھی آپؐ کو بہت پسند تھا۔ ہم سب کو بھی اپنے جسم اور لباس کی صفائی ستھرائی کا بے حد خیال رکھنا چاہیے۔

☆ آپؐ ہر اچھا اور پاکیزہ کام دائیں ہاتھ سے کیا کرتے تھے۔ ہاتھ پاؤں دھونے یا وضو یا غسل کرتے وقت آپؐ پہلے دایاں ہاتھ دھوتے یا دائیں طرف سے ابتدا کرتے تھے۔ سوتے وقت بھی دائیں کروٹ پر لیٹتے تھے۔

☆ آپؐ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر دائیں ہاتھ سے کھانا شروع کرتے تھے۔

☆ دستر خوان پر کھانا چاہے کتنا ہی مختصر یا سادہ ہوتا آپؐ نہایت اہتمام اور شوق سے کھاتے تھے۔

☆ کھانا کھاتے وقت روٹی کا ٹکڑا اگر نیچے گر جاتا تو آپؐ اُس کو احتیاط سے اٹھا لیتے تھے۔

☆ آپؐ دستر خوان پر مہمانوں کو شریک کرنا یا کھانے پینے کی چیزیں اپنے پڑوسیوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو بھیجنا نہایت اچھا خیال کرتے تھے۔ گھر میں گوشت کا سالن تیار کرنا ہوتا تو گھر والوں سے تاکید فرماتے کہ شوربہ زیادہ بنائیں تاکہ اس میں سے کچھ کھانا پڑوسیوں کے ہاں بھی بھیجا جا سکے۔ دستر خوان پر مہمان شریک ہوتا تو آپؐ اُس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بار بار فرماتے کہ جناب اور کھائیں اور کھائیں! یہاں تک کہ مہمان خوب سیر ہو کر کھانا کھا لیتا۔

☆ حضورؐ کبھی کسی کھانے میں خواہ مخواہ نقص نہیں نکالتے تھے۔

☆ آپؐ کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ آپؐ کی عادت تھی کہ تھوڑی سی بھوک رکھ کر کھانا کھاتے تھے اور اِسی بات کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

☆ آپؐ کوئی چیز نوش فرماتے تو تین سانسوں میں ختم کرتے تھے۔ آپؐ برتن کو منہ لگائے لگائے سانس لینے کو بُرا سمجھتے تھے۔

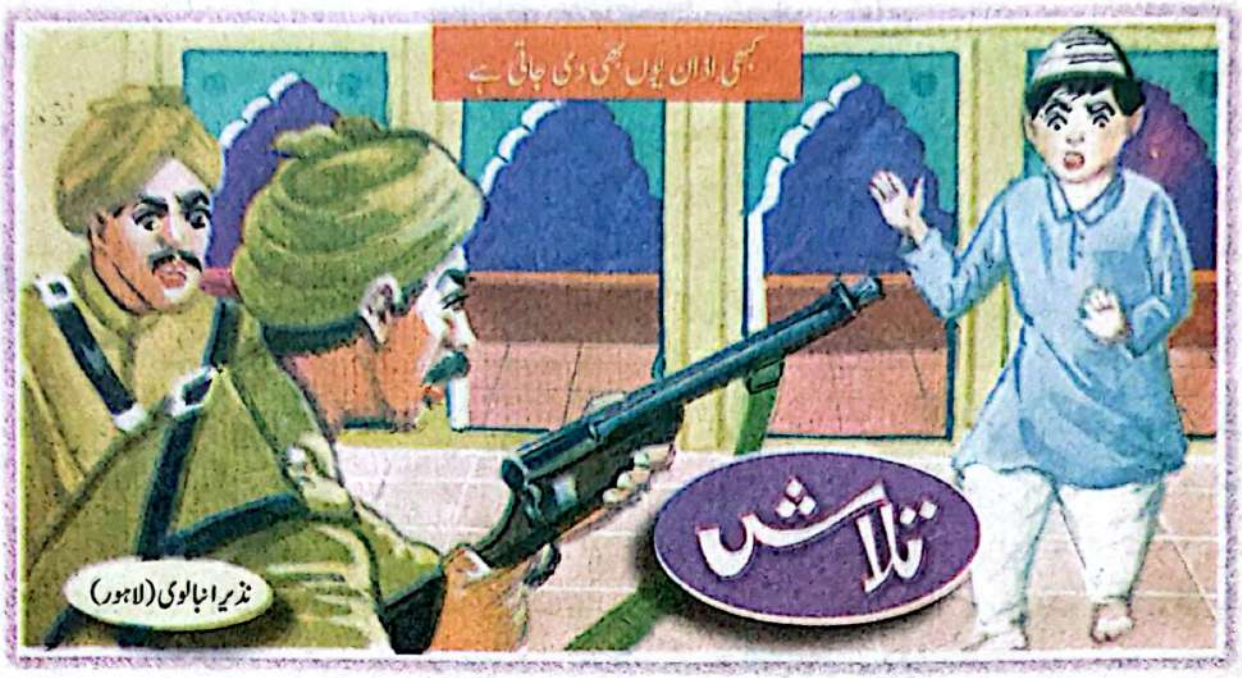

منصور ڈار نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو وہ شام کے پونے چھ بجے کا اعلان کر رہی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا، مگر قریبی مسجد سے اذان کی آواز ابھی تک سنائی نہیں دی تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد بھی اذان کی آواز اُس کے کانوں میں نہ پڑی تو وہ بے چین سا ہو گیا۔ وہ بوجھل قدموں سے اپنی امی جان کے کمرے کی طرف بڑھا۔ امی جان اُس وقت نماز پڑھنے میں مصروف تھیں۔ وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ امی جان نے جب سلام پھیرا تو وہ منصور کو دیکھ کر بولیں۔

"کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے.....؟"

منصور ڈار نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم نے ابھی تک نماز کیوں نہیں پڑھی.....؟" امی جان نے پوچھا۔

"ابھی تک مغرب کی اذان جو نہیں ہوئی۔"

منصور ڈار نے ہاتھوں کے اشاروں سے اپنی امی جان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"اچھا تو یہ بات ہے..... میرے بیٹے! ہمارے علاقے میں اب مغرب اور عشاء کی اذان سنائی نہیں دے گی..... ظالموں نے مقبوضہ وادی میں ایسا کرنے پر پابندی عائد کر دی ہے....." امی جان کی بات سن کر منصور ڈار نے ہاتھوں کے اشاروں سے امی جان سے پوچھا۔

"مگر ایسا کیوں ہوا ہے؟"

"ظالموں کے پاس ظلم کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ وہ طاقت کے نشے میں دھت صرف اور صرف ظلم کرنا جانتے ہیں..... آخر کب تک یہ ظلم ہوتا رہے گا..... وہ دن بہت جلد آئے گا جب ہم آزاد ہوں گے..... ہر طرف اللہ اکبر..... اللہ اکبر کی صدائیں گونج گئیں..... ان صداؤں میں تمہاری اذان کی صدا بھی گونجے گی..... تم ایک شہید موذن کے بیٹے ہو..... تم بھی اذان دو گے....."

یہ سُن کر منصور ڈار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ امی جان کو اسی لمحے احساس ہو گیا کہ انہوں نے یہ بات نظر انداز کر دی تھی کہ منصور ڈار بول نہیں سکتا۔ منصور ڈار نے آنسو پونچھتے ہوئے ہاتھوں کو لہرا کر امی جان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی ماں کی خواہش ضرور پورا کرے گا۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں کام یاب کرے، چلو اب نماز پڑھ لو....." امی جان نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

نماز ادا کرنے کے بعد منصور ڈار اپنے کمرے میں واپس آیا تو اُس کے ذہن میں یہی بات گردش کر رہی تھی کہ وہ اب ہر صورت مسجد میں اذان دے گا۔ وہ اپنے علاقے کی خاموش فضا میں اللہ اکبر..... اللہ اکبر کی صدا بلند کرے گا۔ ایسا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے.....؟ ایک گونگا انسان ایسا کس طرح کر

22 فروری عالمی یومِ اسکاؤٹنگ کے حوالے سے ایک نظم

اسکاؤٹ

میں ہوں اِسکاؤٹ ، ہے میرا کام خدمت دوستو
اور خدمت میں چھپی ہے ساری عظمت دوستو

جو ضرورت مند ہوں اُن تک پہنچ جاتا ہوں میں
اُن کی خدمت کر کے اک تازہ خوشی پاتا ہوں میں

مستحق اِمداد کا ، مجھ کو جہاں آواز دے
چند ہی لمحوں میں اپنے پاس پاتا ہے مجھے

دُھوپ چاہے ہو کڑی یا سخت سردی ہو مگر
راستے میں مشکلیں ہوں، یا کوئی خوف و خطر

امن ہو یا جنگ ، ہر دُکھیا کے کام آتا ہوں میں
دُوسروں کے دُکھ بٹا کر راحتیں پاتا ہوں میں

زخمیوں کے زخم پر مرہم رکھا کرتا ہوں میں
کام جو غفلت کے ہوں اُن سے بچا کرتا ہوں میں

خاص وردی ہے مری اور نیک میرے کام ہیں
جو دُعائیں مجھ کو ملتی ہیں مرا اِنعام ہیں

مستحق: حق دار

ضیاء الحسن ضیاء، کراچی

سکتا ہے.....؟ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ حال سے ماضی میں جا پہنچا۔ اُس کے کانوں میں ایک خوش الحان آواز پڑی۔

"اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔" یہ اُس کے بابا کی آواز تھی۔ اذان سن کر وہ مسجد کی طرف بڑھا۔ نمازی اقامت سن کر نماز کی ادائیگی کے لئے کھڑے ہو چکے تھے۔ ننھا سا منصور ڈار بھی آخری صف میں کھڑا ہو گیا۔ گھر واپس آتے ہوئے اُس نے بابا سے کہا۔

"بابا جان! آپ کی آواز بہت اچھی ہے۔"

"میری آواز اتنی اچھی نہیں جتنے وہ خوب صورت لفظ اچھے ہیں، جن کی ادائیگی سے میں لوگوں کو مسجد کی طرف بلاتا ہوں....." بابا نے کہا۔

"بابا جان! کیا میں بھی آپ کی طرح اذان دے سکتا ہوں؟" منصور ڈار نے پوچھا۔

"ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں..... میں تمہیں مشق کروا دوں گا، تم بھی میری طرح اذان دے سکو گے، وعدہ کرو میرے مرنے کے بعد اِس مسجد میں اذان دیتے رہو گے۔"

"بابا! میں وعدہ کرتا ہوں اِس مسجد میں اذان دیتا رہوں گا۔"

"شاباش میرے بیٹے..... جیتے رہو..... خوش رہو....." بابا جان مسکرا کر بولے۔

چند ہفتے بابا جان نے منصور ڈار کو اذان دینے کی مشق کروائی تو وہ اس قابل ہو گیا کہ اچھے طریقے سے اذان دے سکے۔

ایک شام بابا جان نے منصور ڈار کو سپیکر کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"بابا جان! کیا میں اذان دوں؟"

"ہاں ہاں..... آج تم اذان دو گے....."

"بابا جان! مجھے جھجک محسوس ہو رہی ہے۔" منصور ڈار بولا۔

"نیک کام میں جھجک کس لئے..... چلو بسم اللہ کرو....." بابا جان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ منصور ڈار نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر اذان دینا شروع کی۔ اس کی پُر اثر آواز سن کر لوگ عش عش کر اٹھے۔ سب نے منصور ڈار کو شاباش دی۔ وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ گھر آنے پر امی جان نے بھی اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

"تم واقعی میرے جانشین ثابت ہو گے.....اللہ تعالیٰ تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔" بابا جان نے منصور ڈار کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اُس کی یادوں میں وہ دن بھی محفوظ تھا، جب اُن کے علاقے میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ مجاہدین بھارتی فوجیوں سے جہاد میں مصروف تھے جب کہ عام شہری اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ کرفیو کے دوران منصور ڈار کے بابا جان گھر سے نکلنے لگے تو امی جان نے پوچھا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"نیک بخت! مسجد جا رہا ہوں، اذان کا وقت ہو رہا ہے۔" بابا جان بولے۔

"ان حالات میں کون نماز پڑھنے کے لیے آئے گا.....؟"

"کوئی آئے یا نہ آئے، میرا کام تو انہیں بلانا ہے..... میں آخری دم تک یہ فرض ادا کرتا رہوں گا۔"

"باہر خطرہ ہے..... کہیں آپ کو کچھ....." اس سے آگے امی جان کچھ نہ کہہ سکیں۔

"بیگم! حق کی خاطر لڑنا ہی تو اصل زندگی ہے..... میں ہر حال میں اذان دوں گا....."

یہ کہہ کر ابا جان چلے گئے۔ وہ بھارتی فوجیوں کی نظروں سے بچتے بچاتے مسجد میں پہنچے۔ چند منٹوں بعد مسجد سے اللہ اکبر.....اللہ اکبر کی صدا گونجی۔

"یہ کون ہے جس نے اپنی موت کو آواز دی ہے.....؟" کرنل چوپڑہ نے پوچھا۔

"سر! یہ موذن منظور ڈار ہے۔" ایک فوجی نے کہا۔

"اُسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔" کرنل چوپڑہ چلایا۔

تھوڑی دیر بعد فوجی منظور ڈار کو پکڑ کر لائے تو اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

"اچھا تو یہ ہے جس نے کرفیو کی خلاف ورزی کی ہے۔" کرنل چوپڑہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"یس سر! یہی ہے وہ آدمی جو تھوڑی دیر پہلے اذان دے رہا تھا۔" دیپ کمار بولا۔

"تم کس کی اجازت سے اذان دے رہے تھے.....؟" کرنل چوپڑہ چیخا۔

"مجھے کسی سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے ۔ میں موذن ہوں، میرا کام ہی اذان دینا ہے۔ میرے دادا، میرے بابا بھی یہی کام کرتے ہیں۔ اور اب میرا بیٹا بھی یہی نیک کام کرے گا..... وہ لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے گا.....انہیں حق کا راستہ دکھائے گا....." منظور ڈار بولتا چلا گیا۔

"دیپ کمار! یہ تو تقریر بھی بڑی اچھی کرتا ہے..... بھگوان کی قسم ایسے مسلمانوں کو مارتے ہوئے دکھ تو ہوتا ہے، مگر کیا کریں سرکار پھر سرکار ہے..... کیا خیال ہے..... اِس کا اور اِس کے بیٹے کا کام تمام نہ کر دیں۔"

"سر اچھا خیال ہے مگر....." دیپ کمار بولا۔

"مگر کیا.....؟" کرنل چوپڑہ بولا۔

پھر دیپ کمار نے کرنل چوپڑہ سے کچھ کہا، جسے سن کر اُس نے فوراً کہا۔

"واہ..... یہ ترکیب خوب رہے گی، ابھی اور اِسی وقت اِس پر عمل کرو، واہ کیا زبردست ترکیب بتائی ہے۔"

منصور ڈار کو بھی بھارتی فوجیوں نے گھر سے پکڑ کر ٹارچر سیل میں اس کے بابا جان کے ساتھ باندھ دیا۔ چوپڑہ کے اشارے پر فائر ہوا اور منصور ڈار کے بابا جان اُس کی آنکھوں کے سامنے ٹھنڈے ہو گئے۔

"اب اِس کی باری ہے..... موذن ابن موذن کی..... چلو اپنا کام کرو....."

یہ سن کر راجیش نامی ایک فوجی نے آگے بڑھ کر منصور ڈار کی زبان کاٹ دی۔ ٹارچر سیل میں ایک دلخراش چیخ گونجی اور منصور ڈار ہمیشہ کے لیے گونگا ہو گیا۔ بھارتی فوجی منظور ڈار کی لاش اور بے ہوش منصور ڈار کو اُن کی گلی میں پھینک گئے۔ اِس الم ناک واقعے پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ ہوش میں آنے پر لوگوں نے منصور ڈار کو تسلی دی تو اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ اُسے دُکھ اِس بات کا تھا کہ اب اذان کون دے گا؟

وہ ماضی سے حال میں اُس وقت پہنچا، جب امی جان اُس کے کمرے میں آئیں۔

"بیٹا! عشاء کا وقت ہو گیا ہے۔ نماز پڑھ لو۔" اُس نے امی جان کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ وہ تھوڑی دیر پہلے اس ہولناک منظر کو یاد کر رہا تھا، جب اس کی زبان کاٹی گئی تھی۔ منصور ڈار خاموشی سے وضو کے لئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

ماں

☆ ماں زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی کا مینار ہے۔
☆ ماں کی محبت پھول سے زیادہ تر و تازہ اور لطیف ہے۔
☆ ماں ایک پھول ہے جو کانٹا چبھنے کے باوجود مسکراتا ہے۔
☆ ماں کو مصیبت کے وقت جب بھی یاد کرو تو سکون ملتا ہے۔
☆ ماں کی دُعا کامیابی کا راز ہے۔

(محمد تنویر انگرا، پیلووینس)

وہ رات بھر اس بات پر غور کرتا رہا کہ وہ کس طرح اپنے بابا جان سے کیا وعدہ پورا کرے؟ وہ پابندی کے باوجود کس طرح مسجد میں اذان دے سکتا ہے؟ آخر سوچتے ہوئے اُسے ایک راستہ دکھائی دیا، ایسا ممکن تھا۔ کچھ سوچ کر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، جو اِس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو گا۔

----☆☆----

صبح کے وقت وہ مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک سبز رنگ کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ دروازے پر دستک دینے پر سترہ اٹھارہ سال کا ایک نوجوان باہر آیا، اُس نے منصور ڈار کو دیکھتے ہی بے اختیار گلے سے لگا لیا۔

"منصور ڈار..... میرے دوست..... آؤ..... آؤ....."

منصور ڈار نے اشارے سے سمجھایا کہ اُس کے پاس وقت کم ہے۔

"کیا کسی کام سے آئے ہو.....؟"

منصور ڈار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بتاؤ کیا کام ہے.....؟"

منصور ڈار نے ہاتھوں کے اشاروں سے اپنے دوست کو کچھ سمجھایا تو وہ ذرا ٹھہر کر بولا۔

"ہاں..... ہاں..... میں سمجھ گیا ہوں..... میں ابھی لایا۔"

یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

----☆☆----

سورج تمام دن سفر کرنے کے بعد مغرب میں غروب ہوا تو لوگوں کے کانوں میں مغرب کی اذان کی آواز پڑی۔ اِس سے قبل کہ موذن اذان پوری کرتا۔ بھارتی فوجی مسجد میں داخل ہوئے۔ منصور ڈار نے خطرے کو بھانپتے ہوئے مسجد کے ہال کا دروازہ بند کر لیا تھا۔

"دروازہ کھولو، ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔" کرنل چوپڑہ بولا۔

"حی علی الفلاح..... حی علی الفلاح۔"

اذان کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

"اذان دینا بند کرو ورنہ تمہیں گولیوں سے بھون دیا جائے گا....." راجیش چیخا۔

"اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... لاالہ الا اللہ۔"

اذان ختم ہوتے ہی منصور ڈار نے مسجد کے ہال کا دروازہ کھول دیا۔ بھارتی فوجی تیزی سے اندر داخل ہوئے۔

"سر! یہ تو گونگا ہے..... یہ کس طرح اذان دے سکتا ہے..... اس کے ساتھ لازماً کوئی اگر وادی ہو گا..... بتاؤ کون تھا تمہارے ساتھ.....؟" دیپ کمار بولا۔

"بتاؤ کون اذان دے رہا تھا.....؟" کرنل چوپڑہ نے منصور ڈار کا گریبان پکڑ لیا۔

منصور ڈار نے اشارے سے بتایا کہ یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔

"جھوٹ مت بولو..... تم گونگے ہو، تم کس طرح اذان دے سکتے ہو.....؟ سیدھی طرح بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کون تھا؟" راجیش بھی بول پڑا۔

منصور ڈار بھارتی فوجیوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ اکیلا ہی مسجد میں موجود تھا۔

کرنل چوپڑہ نے چلا کر کہا۔

"فائر۔" فضا میں فائر کی آواز گونجی اور منصور ڈار شہادت کا جام نوش کر کے مسجد کے فرش پر گر پڑا۔ اِس کے شہید ہوتے ہی بھارتی فوجیوں نے اُس اگر وادی کی تلاش شروع کی، جس نے اذان دی تھی۔ دیپ کمار نے دائیں طرف کی الماری کھولی تو اُس میں ایک ٹیپ ریکارڈر پڑا تھا۔ دیپ کمار نے کیسٹ کو پیچھے کر کے پلے کا بٹن دبایا تو فضا "اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... اللہ اکبر....." کی صدا سے گونج اُٹھی۔

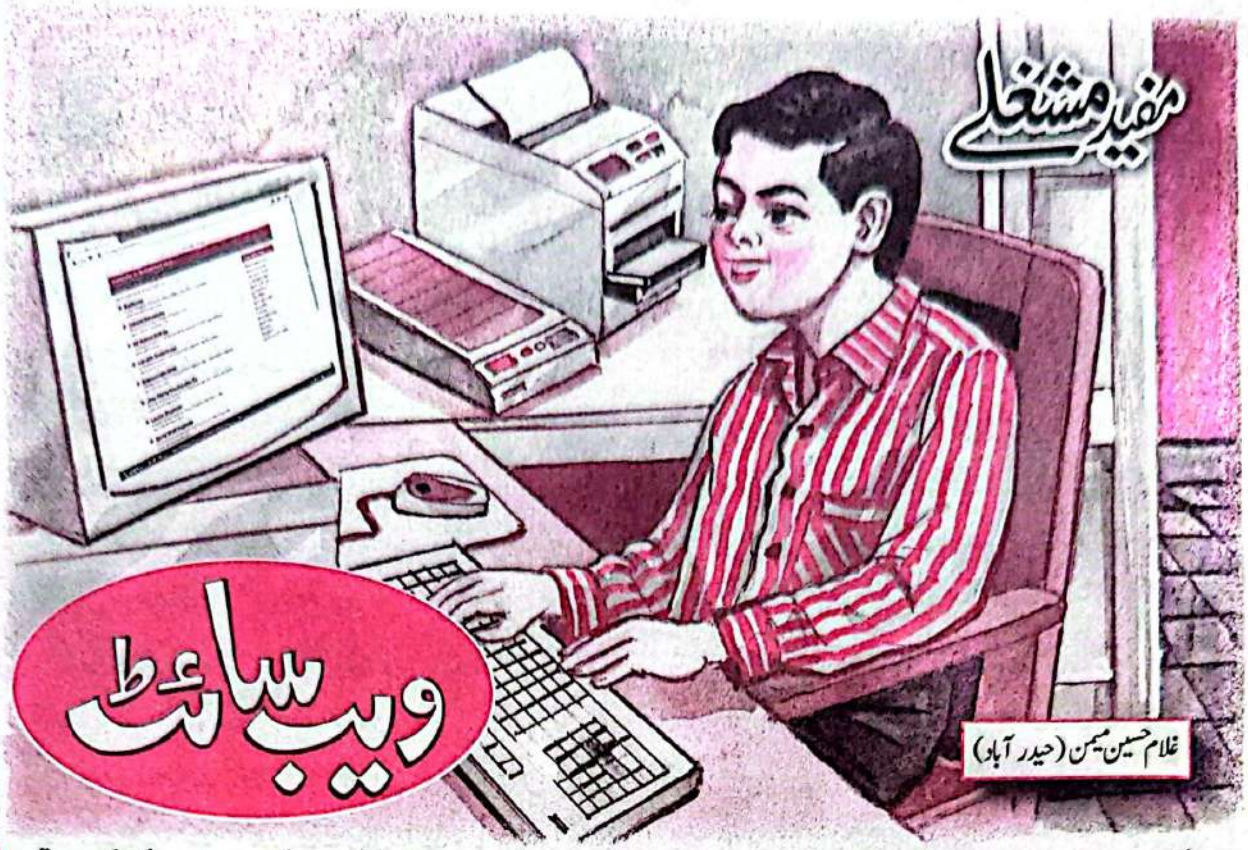

ویب سائٹ

غلام حسین میمن (حیدر آباد)

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ بیسوی صدی کی سب سے بڑی اور اہم ایجاد کیا ہے.....؟ یقیناً آپ کا جواب ہو گا کمپیوٹر۔ کمپیوٹر کی آج پوری دُنیا پر حکمرانی ہے۔ ہم اپنے اِردگرد دیکھیں تو گھروں، کاروباری مراکز اور دفاتر غرض ہر جگہ کمپیوٹر نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کمپیوٹر نے وہ کام بھی کر دکھایا جو اِس سے قبل ناممکن نظر آتا تھا۔ مثلاً موبائل فون اور ایس ایم ایس (موبائل پیغامات) اسی کمپیوٹر کی مرہون منت ہیں۔ منٹوں میں ہماری رقم کا اندراج ایک شہر سے دُوسرے شہر اور ایک ملک سے دُوسرے ملک میں ہو جاتا ہے، اسے آن لائن بینکنگ سسٹم کہتے ہیں۔ اس جیسی لا تعداد مثالیں ہمیں اپنے اِردگرد نظر آتی ہیں۔ آپ کا پسندیدہ رسالہ تعلیم وتربیت بھی کمپیوٹر کمپوزنگ کی بہ دولت ہی سج دھج کر آتا ہے۔

آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کمپیوٹر کا آغاز کیلکولیٹر کی شکل میں ہوا تھا، جس کا مقصد ریاضی کے مشکل اور طویل سوالات حل کرنا تھا۔ آج کمپیوٹر کی ایجاد ہمیں حیران کیے دیتی ہے۔ اس کی ایک اور جدید شکل لیپ ٹاپ (Lap Top) ہے۔

کمپیوٹر کیا کچھ کر سکتا ہے.....؟ اس کا جواب تو آپ کو اس کا استعمال کر کے ہی مل سکتا ہے، مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ کمپیوٹر اور ٹیلی فون کے ذریعے ہم انٹرنیٹ تک رسائی باآسانی کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ کیا ہے.....؟ یہ کمپیوٹر کا بین الاقوامی موبوط نظام ہے۔ ایک ایسا نظام جس کے ذریعے ہم گھر بیٹھے دُنیا کے کسی بھی ملک کی معلومات جس کا تعلق ادب سے لے کر سیاست تک، فنونِ لطیفہ سے لے کر سائنسی تحقیق تک ہو، دیکھ سکتے ہیں اور معلومات لے سکتے ہیں۔ دُنیا کے نامور مفکرین، شاعروں، ادیبوں، سائنس دانوں اور کھلاڑیوں غرض کہ ہر شعبہ زندگی کی اہم شخصیات کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ تصاویر دیکھ سکتے ہیں اور پھر اسے اپنے PC (پرسنل کمپیوٹر) میں محفوظ کر سکتے ہیں۔

انٹرنیٹ پر دستیاب معلومات کی کوئی انتہا نہیں، اگر آپ کے پاس وقت ہے، مہارت ہے اور کچھ پانے کی جستجو ہے تو آپ کمپیوٹر کے توسط سے انٹرنیٹ پر موجود ہر مفید معلومات تلاش کر سکتے ہیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اپنے خطوط ای میلکر سکتے ہیں اور وصول کر سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کچھ بچے ویب سائٹ کے بارے میں نہ جانتے ہوں وہ بچے

یہ جان لیں کہ دراصل انٹرنیٹ اور معلومات کا گہرا تعلق ہے۔ اس سہولت کی بہ دولت ہم دفتری، معاشرتی، علمی اور طبی ضروریات سمیت ہر قسم کی معلومات با آسانی حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی معلومات دُوسروں تک پہنچا سکتے ہیں اور پھر یہی معلومات اپنے کمپیوٹر کی طاقت ور ہارڈ ڈسک (Hard Disc) میں طویل عرصے تک کے لیے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

اب تو مختلف رسائل اور اخبارات بھی آپ انٹرنیٹ پر پڑھ سکتے ہیں۔ ہوائی جہاز کی آمدورفت کا شیڈول، دُنیا میں ہونے والی نت نئی ایجادات اور دریافت کا احوال، طبی تحقیق میں پیش رفت سے متعلق معلومات سمیت ہر چیز انٹرنیٹ پر مل سکتی ہے۔ انٹرنیٹ پر موجود مختلف ویب سائٹس دراصل ایک ایسی دُنیا ہے، جس میں علم کے متلاشی کھو جاتے ہیں۔ یہاں ہر قسم کی ویب سائٹ موجود ہے، جو آپ کی علمی پیاس بجھانے کے لیے ہمہ وقت موجود ہے۔ یہاں آپ دُنیا کے ہر بڑے تعلیمی ادارے کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ دُنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود کتب کے بارے میں پتہ چل سکتا ہے اور اب تو مختلف کتب خانے نایاب اور اہم کتب کو قارئین کے لیے ویب سائٹس پر بھی فراہم کر رہے ہیں۔

اگر آپ کو شعروشاعری سے دل چسپی ہے اور آپ فارغ وقت میں اس کے مطالعے کے خواہش مند ہیں تو اس سلسلے میں بھی کئی مفید ویب سائٹس موجود ہیں۔ آپ کارٹون دیکھ سکتے ہیں، معلوماتی پزل حل کر سکتے ہیں۔ رنگوں اور مصوری کے شوقین حضرات بھی یہاں اپنے مشغلے کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔

یقیناً ایک سوال آپ کے ذہن میں یہ بھی آسکتا ہے کہ اِن مفید اور معلوماتی ویب سائٹس کے پتہ جات کیسے حاصل ہوں اور نئی معلوماتی ویب سائٹس کے بارے میں وقتاً فوقتاً ہم کیسے جان پائیں تو اِس کے لیے آپ اپنے اُن دوستوں سے معلوم کرسکتے ہیں۔ رسائل میں بھی ان ویب سائٹس کے بارے میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مارکیٹ میں موجود اچھی کتب بھی اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتی ہیں۔ اِس کے علاوہ مختلف اداروں، جامعات اور لائبریریز کی ویب سائٹس کے لیے ان کے شائع اشتہارات سے یا وہاں فون کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مختلف دستاویزی و معلوماتی پروگرامز جو ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں اُن میں بھی مختلف ویب سائٹس سے متعلق بتایا جاتا ہے۔

اب ہم آپ کو بچوں سے متعلق کچھ ویب سائٹس کا تعارف کراتے ہیں اور ساتھ پتے بھی دے رہے ہیں تاکہ آپ خود ان سے فائدہ اٹھائیں۔

جب آپ کے ذہن میں کیا، کیوں اور کیسے؟ جیسے سوالات پیدا ہوں گے تو دیکھیے۔

- www.faqkids.com
  اقوالِ زریں کے لیے دیکھیے۔
- www.quotegarden.com / children.html.
  کھیل، لطیفے، کہانیاں اور موسیقی کے لیے۔
- www.kidsranch.org.
  بچوں کی مختلف کتابوں کے لئے دیکھیے۔
- www.kidsbookshelf.com
  تصویروں میں رنگ بھرنے کے لیے۔
- www.crayola.com
  رنگین کارٹون کرداروں کے لئے دیکھیے۔
- www.netsmartzkids.org
  سائنسی تجربات اور سرگرمیوں کے لیے۔
- www.inventivekids.com
  درختوں اور ماحولیاتی آلودگی کے بارے میں جاننے کے لیے۔
- www.arborday.org
  ڈاکٹری نسخوں کے لیے۔
- www.children-special-needs.org
  انگریزی شعر وشاعری کے لیے۔
- www.Poetry4kids.com

آپ ان ویب سائٹس کو دیکھیں اور اپنے علم میں اضافہ کر کے ملک وقوم کی بھلائی کے لئے کام کریں۔

!!!☆!!!

پھر یوں ہوا

محمد فاروق انجم (فیصل آباد)

دونوں ایک جگہ ہوں اور کوئی شرارت ، کوئی ہنگامہ اور اِس کی ٹوپی اُس کے سر پر نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اسکول ہو، گھر ہو یا کھیل کا میدان، دونوں کی شرارتیں ہر جگہ ہوتی تھیں۔ سنجیدگی دونوں سے دُور رہتی تھی۔ وہ کبھی چھپ کر اور بعض اوقات سب کے سامنے دانت نکالتے تھے، شیطان سے اُن کی بہت دوستی تھی۔

ایک کا نام علی اور دُوسرے کا نام عدیل تھا۔ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور ایک ہی سکول میں نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ پڑھائی میں ایسے تھے کہ بس پاس ہو جاتے تھے۔ دونوں اس بات کا شکر کرتے تھے کہ وہ پاس ہو گئے ہیں اور استاد اس بات پر خوش ہوتے تھے کہ دونوں سے جان چھوٹ گئی۔

دونوں کسی بھی مقصد کو لے کر آگے نہیں چل رہے تھے۔ وہ نویں جماعت میں پہنچ گئے تھے، لیکن ابھی تک انہوں نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ وہ کیا بننا چاہتے ہیں، پڑھائی سے وہ کس منزل کو پانا چاہتے ہیں، وہ سکول کیوں جاتے ہیں؟ بس وہ سکول جاتے اور واپس آتے تھے اور اپنی شرارتوں سے بھری زندگی میں مست تھے۔ وہ کہتے تھے کہ پڑھائی میں ان کا دل نہیں لگتا۔ انگریزی کی بڑی بڑی سمریاں اور ریاضی کے سوال حل کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے شروع سے ہی دل لگا کر پڑھائی نہیں کی تھی اور جب تک وہ سکول میں ہیں، اِسی طرح ہنس کھیل کر وقت گزار دیں گے۔ سب دونوں کی شرارتوں سے تنگ تھے۔

اُس دن دونوں سکول سے پیدل واپس گھر آ رہے تھے۔ چائے کے ایک کھوکھے کے سامنے سے گزرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ ایک سائیکل کھڑی ہے۔ سائیکل کے پیچھے ایک جال میں مرغیاں تھیں۔ دو درجن سے زیادہ مرغیاں اُس جال کے اندر دبکی بیٹھی تھیں۔

علی اور عدیل نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں مسکرائے۔ مرغیوں کا مالک اندر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

علی اور عدیل نے ایک دُوسرے کو اشارہ کیا اور عدیل کھوکھے کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جب کہ علی نے اپنی طرف کسی کو متوجہ نہ پا کر کمال ہوشیاری سے مرغیوں کے اُوپر پڑے جال کا ایک کونا کھول کر جال اُوپر کر دیا۔ اب مرغیوں کے نکلنے کا راستہ بن گیا تھا۔ مرغیاں بھی شاید اِسی انتظار میں تھیں۔ مرغیاں آناً فاناً شور مچاتیں جال سے نکل کر

چھلانگیں مار کر باہر نکلنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے مرغیاں باہر نکل کر سڑک پر دوڑنے لگیں۔ مرغیوں کا شور اور پھر لوگوں کی آوازیں۔

"ارے مرغیوں نکل گئیں..... مرغیوں کو پکڑو....."

یہ آوازیں مرغیوں کے مالک کے کان میں بھی پڑیں، وہ گھبرا کر باہر کی طرف بھاگا۔ باہر کا منظر ہی عجیب تھا۔

اُس کی تمام مرغیاں سڑک پر بھاگ رہی تھیں۔ کوئی کسی موٹر سائیکل کے نیچے آنے سے بچی تو کوئی کار کے ٹائر کے ساتھ لگ کر دُوسری طرف جان بچا کر بھاگی، اور کسی سائیکل سوار کو بریک لگا کر مرغے کی جان بچانا پڑی۔ مرغیوں اور لوگوں کے شور سے کہیں زیادہ اُس آدمی کا شور تھا جو ان مرغیوں کا مالک تھا۔

"ارے میری مرغیاں پکڑو..... جس نے ایسا کیا ہے میں اُسے نہیں چھوڑوں گا....." وہ آدمی چلا رہا تھا۔

"پہلے مرغیاں پکڑ لو پھر کوئی اور بات کرنا۔" کسی نے زور سے کہا۔

اسی اثنا میں ایک بزرگ اُس آدمی کے پاس گیا اور بولا۔ میں نے دیکھا ہے..... یہ شرارت ان دونوں کی ہے۔"

اس آدمی نے جیسے ہی علی اور عدیل کی طرف اشارہ کیا، وہ شخص اپنی مرغیاں بھول گیا اور غصے سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"تو یہ تم دونوں نے کیا ہے؟" وہ دانت پیس کر بولا۔

علی اور عدیل اُس کا غصہ دیکھ کر بھاگنے کے لئے پر تولنے لگے۔

"ان مرغیوں کی قیمت تم دونوں سے وصول کروں گا۔"

وہ آدمی یہ کہتے ہوئے تیزی سے دونوں کے پیچھے بھاگا۔

علی اور عدیل بہت تیز بھاگ رہے تھے اور ان کو پکڑنے کے لئے مرغیوں کے مالک کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی لوگ بھاگ رہے تھے۔

"ارے یہ تو بہت زیادہ لوگ ہیں۔" علی نے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تیز بھاگو..... پکڑے گئے تو یہ شرارت ہمیں بہت مہنگی پڑے گی۔" عدیل نے بھاگتے ہوئے کہا۔

"بھاگنے کی بجائے کہیں چھپنے کی سوچو۔" علی نے دائیں بائیں گردن گھماتے ہوئے کہا۔

"چھپنے کا وقت نہیں ہے، بھاگتے رہو۔" عدیل نے کہا۔

علی اور عدیل بھاگتے ہوئے دائیں جانب مڑ گئے۔ وہ گلی سیدھی الیکٹرونک کی اشیاء فروخت کرنے کے بازار میں نکلتی تھی۔ دونوں برق رفتاری سے بازار میں داخل ہو گئے۔ بازار میں عدیل کے چچا کی بھی دُکان تھی۔ جہاں اُس وقت بہت سے ٹیلی ویژن چل رہے تھے۔ ان کا تعاقب کرنے والے بازار تک آئے، لیکن متلاشی نگاہوں سے دیکھنے کے باوجود انہیں دونوں کہیں بھی دکھائی نہیں دیئے۔

"بھاگ گئے....." ایک آدمی بولا۔

"بھاگ تو ہم بھی رہے تھے۔" دُوسرے نے کہا۔

"وہ تیزی سے بھاگ گئے ہیں۔" تیسرا آدمی بولا۔

"میرا نقصان تو کر گئے..... اب میں ایک ایک مرغی کیسے پکڑوں گا۔" وہ آدمی لاچاری سے بولا۔

"بھائی ہم جو کر سکتے تھے وہ کیا..... جتنا تیز بھاگ سکتے تھے بھاگے..... مرغیاں پکڑنا اَب تمہارا کام ہے۔" ایک آدمی نے

انمول باتیں

☆ حقیر سے حقیر پیشہ بھیک مانگنے سے بہتر ہے۔
☆ شرافت افعال واعمال کی عمدگی سے ظاہر ہوتی ہے۔
☆ بُرے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے۔
☆ علم ایسا بادل ہے جس سے رحمت برستی ہے۔

(محمد مزمل حسین، ساہی وال)

یہ کہا اور دُوسرے لوگوں کو آنے کا اشارہ کر کے وہاں سے چل پڑا۔

-----☆☆-----

اس واقعے کو کئی سال گزر گئے۔

شہر کے ایک نوجوان بزنس مین کی میٹنگ میں لمبی میز کے دائیں بائیں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے سامنے ایک بڑی اسکرین کا ٹیلی ویژن دیوار کے ساتھ نصب تھا۔ نوجوان بزنس مین نے خاص طور پر اپنے بزنس سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ سب کی نگاہیں ٹیلی ویژن اسکرین پر مرکوز تھیں۔

ٹیلی وژن اسکرین پر ایک تقریب براہ راست دکھائی جا رہی تھی۔ اس تقریب میں دکھایا جا رہا تھا کہ ایک ہال میں ملک کی بڑی بڑی شخصیات موجود تھیں۔ کچھ دیر کے بعد اسٹیج سیکرٹری نے ایک نوجوان کا نام پکارا۔ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا، وہ نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑے پُر وقار انداز میں چلتا ہوا اسٹیج تک گیا۔ وہاں مہمانِ خصوصی کھڑے تھے۔ دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پھر مہمانِ خصوصی نے اس نوجوان کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا اور ایک بار پھر ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ اس نوجوان نے کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں ایسا کمال کر دیا تھا کہ جس سے ملک کا نام روشن ہو گیا تھا اور اس ٹیکنالوجی پر پوری دُنیا حیران رہ گئی تھی۔

تالیوں کی گونج اس ہال میں ہی نہیں تھے بلکہ میٹنگ میں بھی موجود سب لوگ تالیوں بجا رہے تھے۔ نوجوان بزنس مین کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

تقریب اپنے اختتام کو پہنچی تو وہ نوجوان سب سے مخاطب ہوا۔

"یہ میرا دوست عدیل اشرف ہے، جس نے اپنا ہی نہیں بلکہ ملک کا نام بھی روشن کر دیا ہے، میں اس کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا اور شرارتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہوتا تھا۔"

وہ نوجوان یہ کہتے کہتے ماضی میں کھو گیا۔ سب اُس کی طرف متوجہ تھے۔ وہ بولتا رہا۔

"مجھے یاد ہے کہ ہماری آخری شرارت وہ تھی جب ہم نے ایک غریب کی مرغیاں جال سے نکال دی تھیں اور وہ ہمارے پیچھے بھاگا تھا۔ ہم بھاگ کر عدیل کے چچا کی دُکان میں چلے گئے تھے، وہ الیکٹرونک کی دُکان تھی۔ وہاں اُس وقت کئی ٹیلی ویژن

چل رہے تھے۔ ابھی بھاگتے ہوئے دُکان میں داخل ہی ہوئے تھے کہ ہم نے اچانک دیکھا۔

یہ کہہ کر نوجوان چپ ہو گیا۔ سب اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ پھر بولا۔

"ٹیلی ویژن کی اسکرین پر ایک غیر ملکی تقریب دکھائی جا رہی تھی۔ اس ملک کے صدر اپنے ایک ایسے شہری کو انعام دے رہے تھے، جو دونوں ٹانگوں سے محروم تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں معذور ہونے کے باوجود اُس نوجوان نے اپنی معذوری کو مجبوری نہیں بنایا تھا اور تعلیم کی منزلیں طے کرتا ہوا ایک قابل ڈاکٹر بن گیا تھا، جس نے میڈیکل کے شعبے کو اپنی ذہانت سے نئی راہوں سے آشنا کیا تھا۔"

وہ نوجوان پھر چپ ہو گیا۔ میٹنگ میں مکمل سکوت تھا۔ سب کی نگاہوں نوجوان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ کچھ توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

"ہم نے اُسی جگہ ایک دُوسرے کی طرف دیکھا، اپنا جائزہ لیا۔ ہمارے ہاتھ، آنکھیں، ٹانگیں، اور جسم کے سب اعضا سلامت اور ٹھیک تھے۔ ہم نے سوچا کہ یہ نوجوان معذور ہو کر اِس منزل تک پہنچ گیا ہے، جس پر اس کے ملک کو فخر ہے اور ہم صحت مند ہونے کے باوجود اپنا قیمتی وقت فضول شرارتوں، ہنسی مذاق اور دُوسروں کا نقصان کر کے ضائع کر رہے ہیں۔ تب ہم نے فیصلہ کیا کہ ہنسی مذاق کو بھول کر صرف اور صرف تعلیم پر توجہ دیں گے۔ آج میرا وہ دوست ملک کے وقار کا ایک حصہ ہے اور میں..... علی شہزاد..... ایک کام یاب بزنس مین کے روپ میں آپ کے سامنے ہوں۔"

علی یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔ میٹنگ میں پہلے تو مکمل سکوت تھا پھر یک دم سب کے ہاتھ اُٹھے اور میٹنگ ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔

!!!☆!!!

سفارش

ایک نوجوان قائداعظم کے پاس پہنچا اور اپنی بے روزگاری کا حال بیان کر کے کسی ملازمت کے لیے سفارش کی درخواست کی۔

قائداعظم نے زندگی بھر کسی کی سفارش نہیں کی تھی، کیوں کہ وہ اِسے اصول کے خلاف سمجھتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے نہ جانے کس خیال سے نوجوان سے پوچھا۔

"تم نے دورانِ تعلیم کھیلوں میں حصہ لیا ہے؟"

طالب علم نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

"کیا کالج کی ادبی سرگرمیوں میں تم کتنا حصہ لیتے تھے؟"

"میں نے کبھی کالج کی ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ نہیں لیا۔"

"نصاب کے علاوہ کالج کی کسی بھی سرگرمی میں تم نے کبھی حصہ لیا ہے؟" قائداعظم نے تیسرا سوال پوچھا۔

نوجوان نے بدستور نفی میں سر ہلایا۔ تب قائداعظم نے خفگی کے انداز میں سر کو جنبش دی اور کہنے لگے۔ "اتنی نالائقی کے باوجود تم یہ توقع رکھتے ہو کہ میں تمہاری سفارش کروں گا۔ نہیں، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔"

نوجوان نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ "آپ میری سفارش کریں یا نہ کریں، لیکن میں اپنے بارے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

قائداعظم نے یہ جملہ سنا تو فوراً نوجوان کو واپس آنے کے لیے آواز دی، لیکن وہ باہر جا چکا تھا۔ قائداعظم نے اپنے سیکرٹری کو بلا کر کہا کہ وہ نوجوان کو واپس لائے۔ جب نوجوان دوبارہ آیا تو قائداعظم نے کہا۔

"میں اپنے اصول کے خلاف تمہاری سفارش کروں گا بس تمہیں مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہو گا کہ زندگی بھر آج کی طرح ہمیشہ سچ بولو گے۔"

(ذیشان قریشی، لاہور)

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن مجید کی کس سورۂ مبارکہ میں دو مرتبہ بسم اللہ آتی ہے؟

i۔ سورۂ نمل ii۔ سورۂ الاحزاب iii۔ سورۂ محمدؐ

2۔ حضور ﷺ کو پینے والی چیزوں میں کون سی چیز بہت پسند تھی؟

i۔ پانی ii۔ دودھ iii۔ جوس

3۔ پہلی صلیبی جنگ کب ہوئی تھی؟

i۔ 1191ء ii۔ 1192ء iii۔ 1193ء

4۔ انسانی جسم کے کس عضو میں چار خانے ہوتے ہیں؟

i۔ دماغ ii۔ دل iii۔ گردے

5۔ پانی کتنے ڈگری سینٹی گریڈ پر اُبلتا ہے؟

i۔ 80ڈگری ii۔ 100ڈگری iii۔ 120ڈگری

6۔ جزیروں کا دیس ایشیاء کے کس ملک کو کہا جاتا ہے؟

i۔ جاپان ii۔ تھائی لینڈ iii۔ انڈونیشیا

7۔ پاکستان کے کس شہر کو "لعل پاکستان" کہا جاتا ہے؟

i۔ ملتان ii۔ لاہور iii۔ کراچی

8۔ کس مزاح نگار نے اپنی کتاب "روزنِ دیوار" میں اپنی وفات پر ایک تعزیتی کالم لکھا ہے؟

i۔ کرنل محمد خان ii۔ عطاء الحق قاسمی iii۔ شفیق الرحمٰن

9۔ گلگت بلتستان کے وزیر اعلیٰ کا کیا نام ہے؟

i۔ سید مہدی شاہ ii۔ سید نواب شاہ iii۔ غلام ربانی شاہ

10۔ پاکستان کا قومی کھیل کون سا ہے؟

i۔ فٹ بال ii۔ کرکٹ iii۔ ہاکی

جوابات علمی آزمائش جنوری 2010ء

1۔ مسجد قباء 2۔ 360 بت 3۔ سورج گرہن 4۔ مچھلی۔ 5۔ حضرت خالد بن ولیدؓ 6۔ 18 مرتبہ 7۔ تپ دق 8۔ پتوں میں 9۔ ہوا 10۔ گرین لینڈ 11۔ اونٹ 12۔ نسیم حجازی 13۔ جاوید میاں داد 14۔ لاہور 15۔ بلوچستان 16۔ بحری فوج کا سربراہ۔

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ آسیہ ظاہر، کوئٹہ (200روپے کی کتب)

☆ پرویز احمد، اسلام آباد (175روپے کی کتب)

☆ نور العین، راول پنڈی (125روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: دامنِ زہرا، محمد عمیر اشرف اسلام آباد۔ حامد نسیم ایبٹ آباد۔ نور فاطمہ لاہور۔ تنزیلہ اسلم گوجرانوالا۔ حافظ غلام غوث لاہور۔ جنید نعیم دیوان حویلی لکھا۔ آمنہ ظفر لاہور۔ محمد زبیر ارشد ملتان۔ کنول اشرف گوجرانوالا۔ ملک اظہر علی سکھیکی منڈی۔ عبیر صالحہ فیصل آباد۔ سید محمد خرم لاہور۔ حاشر احمد کراچی۔ طہ یاسین حیدر آباد۔ حسن اسلم گورائیہ گوجرانوالا۔ شرجیل عبدالخالق کراچی۔ ارسلان احمد سیال کوٹ۔ محمد آصف ریاض جھنگ۔ حق نواز لاہور۔ فرحین سلیم بہاول نگر۔ یاسر علی لاہور۔ محمد ضیاء اللہ میاں والی۔ صبیحہ مرزا لاہور۔ محمد سعید الحسن سکھیکی منڈی۔ عائشہ صدیقہ بھوآنہ۔ ارم نسیم خان کراچی۔ ماریہ بن طارق راول پنڈی۔ رئیسہ صدیقی کراچی۔ عیشۃ الراضیہ طارق، فیصل آباد۔ احمد طارق راول پنڈی۔ صبا وحید گوجرانوالا۔ عروسہ اویس کراچی۔ عائشہ طاہر پشاور۔ سیف اللہ سرگودھا۔ غالیہ ارم لاہور۔ ماہ نور مالک گورائیہ گوجرانوالا۔ بختاور بتول ڈیرہ غازی خان۔ احمد رضا حویلی لکھا۔ مدثرہ خلیل جہلم۔ ربیعہ اقبال کراچی۔ رابیل حنا راول پنڈی۔ صفورہ اصفی کراچی۔ حماد الحسن قریشی راول پنڈی۔ حبیبہ سلامت لاہور۔ آمنہ رزاق کراچی۔ ماریہ فاروق پشاور۔ زینب ناصر فیصل آباد۔ عامر جاوید، اسد جاوید راجن پور۔ خنسار رضوان، موسیٰ عمران لاہور۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 فروری 2010ء

دماغ لڑاؤ

نام: _____

مقام: _____

پتا: _____

_____

معلوماتِ عامہ

☆انسان کے ایک گردے کا وزن تقریباً آدھ پاؤ ہوتا ہے۔

☆اوسطاً انسانی دل کا وزن 12 اونس ہوتا ہے۔

☆انسانی دل کی لمبائی تقریباً 6 انچ ہوتی ہے۔

☆انسانی دل ایک دن میں تقریباً ایک لاکھ آٹھ سو مرتبہ دھڑکتا ہے۔

☆انسانی آنکھ کا وزن 7 گرام ہوتا ہے۔

☆چہرے کی ہڈیوں کی تعداد 14 ہے۔

☆پاکستان میں سٹیٹ بینک کا قیام 1948ء کو عمل میں لایا گیا، جس کا افتتاح قائداعظم محمد علی جناح نے کیا تھا۔

☆پاکستان نے عالمی بینک کی رکنیت 1950ء میں اختیار کی تھی۔

☆سٹیٹ بینک آف پاکستان کا قیام 3 کروڑ روپے سے عمل میں آیا تھا۔

☆پاکستان میں بینک قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے درخواست انعام الرحمٰن علوی نے دی تھی۔

(محمد لقمان اعوان، کوہاٹ)

☆پاکستان کی لمبائی شرقاً غرباً 1287 کلو میٹر اور شمالاً جنوباً 1050 کلو میٹر ہے۔

☆پانیوں کا شہر وینس کو کہتے ہیں۔

☆امریکہ کا قومی کھیل بیس بال ہے۔

(ذیشان احمد صدیقی، میاں والی)

☆فارسی کے عظیم شاعر اور نثر نگار شیخ سعدی نے اپنی زندگی میں چودہ مرتبہ پیدل حج کیا تھا۔

☆پلاٹینم دُنیا کی قیمتی ترین دھات ہے۔

☆پیاز میں گندھک (سلفر) کے مرکبات آنکھوں میں آنسو لانے کا سبب بنتے ہیں۔

(عسال طاہر، لاہور)

☆21 جولائی 1969ء کو امریکی خلا باز آرم سٹرانگ نے چاند پر قدم رکھا تو اِس سفر پر 50 کروڑ 50 لاکھ ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ اِس وقت یہ رقم ایک ارب 75 کروڑ ڈالر بنتی ہے۔

☆اب تک 12 افراد چاند پر اترنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور آخری بار 1972ء میں چاند پر چہل قدمی کی گئی تھی۔

☆نیل آرم سٹرانگ کے چاند پر اترنے کے منظر کو دُنیا بھر میں پچاس کروڑ افراد نے ٹیلی ویژن پر براہ راست دیکھا تھا۔

(محمد خلیل چودھری، جہلم)

☆دُنیا میں سب سے زیادہ گرمی لیبیا کے شہر عزیزہ میں پڑتی ہے۔ وہاں کا درجہ حرارت 58 تک ہوتا ہے۔

☆پاکستان کا سب سے گرم مقام جیکب آباد ہے۔

☆پاکستان کی سب سے بڑی مسجد شاہ فیصل مسجد اسلام آباد میں ہے۔

☆پاکستان کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن لاہور ریلوے اسٹیشن ہے۔

☆پاکستان کا سب سے زیادہ زلزلہ زون مقام کوئٹہ ہے۔

☆پاکستان کی سب سے بڑی نمک کی کان کھیوڑہ میں ہے۔

☆پاکستان کا سب سے بڑا ایئر پورٹ قائداعظم انٹرنیشنل ایئر پورٹ کراچی ہے۔

☆پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز نشان حیدر ہے۔

(عصمت اللہ غازی، کوئٹہ)

☆راول پنڈی کا پرانا نام گزنی پور ہے۔

☆عام انسان اوسطاً سال میں 30 من پانی پیتا ہے۔

☆سانپ اپنی زبان سے سونگھتا ہے۔

☆مچھر کی عمر صرف ایک ماہ ہوتی ہے۔

☆نیوزی لینڈ میں سانپ نہیں ہوتے۔

(احمد رضا، حویلی لکھا)

☆شہد کی مکھی کی پانچ آنکھیں ہوتی ہیں۔

☆ریگستان کا جہاز اونٹ کو کہتے ہیں۔

☆کچھوا وہ جانور ہے جو مرتے دم تک بڑھتا ہی رہتا ہے۔

☆ہاتھی اپنی زندگی میں چھ مرتبہ دانت بدلتا ہے۔

☆خرگوش 35 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔

☆ہاتھی کے دماغ کا وزن تقریباً گیارہ پونڈ ہوتا ہے۔

☆مگرمچھ کی اوسط عمر 400 سال ہوتی ہے۔

(ضیاء الرحمٰن ضیاء، ساہی وال)

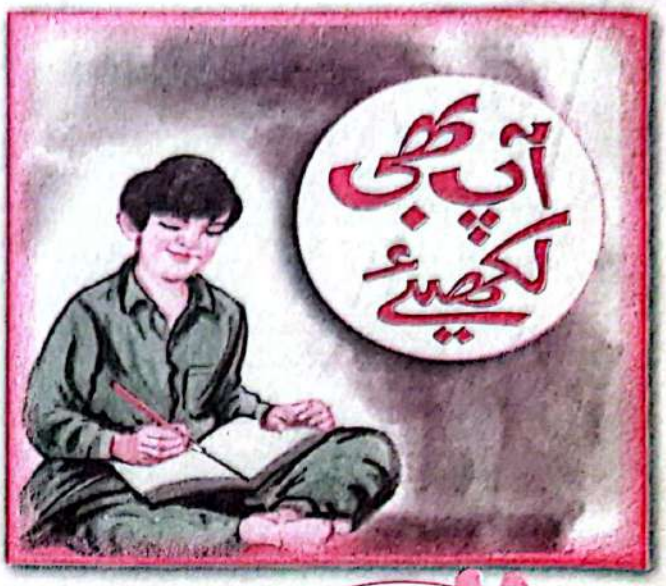

وعدہ

(عمرانہ حنیف، تلہ گنگ)

"آپی! یہ دیکھیں میرے ہاتھ میں کیا ہے؟" علی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

ثنا نے ایک لمحے کے لیے قلم روک کر اُوپر دیکھا۔ "کیوں اُٹھایا ہے تم نے اِس کو گھونسلے سے؟ جاؤ! اس کو واپس رکھ کر آؤ، مر جائے گا یہ۔" اس کے ہاتھ میں چڑیا کا بچہ دیکھ کر آپی بولیں۔

"میں نے اُسے گھونسلے سے نہیں اُٹھایا، مجھے تو یہ لان میں پڑا ہوا ملا ہے۔ اب میں اِسے اُڑاؤں گا۔" وہ دونوں ہاتھوں کو کھول کر اُس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"جب تک اِس کے پر نہیں نکلیں گے یہ اُڑ نہیں سکتا، جاؤ شاباش اِس کو گھونسلے میں رکھ آؤ۔" وہ محبت سے بولیں۔

وہ آپی کی بات سنی ان سنی کر کے باہر نکل گیا۔ آپی بھی اس کے پیچھے تیزی سے باہر نکلیں، لیکن اُن کے چھت پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ چڑیا کے بچے کو فضا میں بلند کر چکا تھا۔ چڑیا کا بچہ بہت تیزی سے زمین سے ٹکرایا اور گرتے ہی مر گیا۔ چڑیا بے تاب ہو کر علی کے سر پر منڈلانے لگی۔ وہ علی کے ہاتھوں میں اپنے بچے کو دیکھ چکی تھی۔

تم نے چڑیا کا بچہ مارا ہے۔" آپی نے یہ کہہ کر علی کو ایک چپت لگائی۔

وہ روتا ہوا امی کو بتانے کے لیے بھاگا۔ آپی بھی چڑیا کے مردہ بچے کو ہاتھوں میں لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔

ثنا! کیوں مارا ہے بھائی کو؟" امی جان نے پوچھا۔

یہ دیکھیں امی! میرے منع کرنے کے باوجود علی نے چڑیا کے اِس بچے کو چھت سے گرا کر مار دیا ہے۔"

بہت بری بات علی، آپ نے اس ننھے سے بچے کو مار کر اِس کی ماں کو بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ آپ اب سات سال کے ہو چکے ہیں، آپ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ بے زبان جانوروں اور پرندوں کو تکلیف نہیں دیتے، ورنہ ان کی بد دُعا لگ جاتی ہے۔" امی علی کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔ چڑیا ابھی تک ان کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔

"میں تو صرف اِسے اڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"بیٹا! پرندے پروں کے بغیر نہیں اُڑ سکتے۔"

"اچھا مجھے تو یہ نہیں پتا تھا۔" علی یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

پھر ثنا نے اپنی امی کے ساتھ مل کر لان میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھودا اور چڑیا کے ننھے سے بچے کو وہاں دفن کر دیا، چڑیا پہلے تو کافی دیر اپنے بچے کی قبر پر منڈلاتی رہی، لیکن پھر اپنے گھونسلے کی طرف اُڑ گئی۔

اگلے دن سکول میں فٹ بال کھیلتے ہوئے علی گرا تو اُس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ سکول انتظامیہ اُسے ہسپتال لے گئی، جہاں ایکسرے کے بعد اُس کی ٹانگ پر پلستر چڑھا دیا گیا۔ جب اُسے گھر لایا گیا تو وہ نیم بے ہوش تھا۔ جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے اپنی ٹانگ پر پلستر دیکھ کر کہا۔

"امی جان! آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ جانوروں اور پرندوں کو تنگ نہیں کرتے، اُن کی بد دُعا لگ جاتی ہے، مجھے بھی اُس چڑیا کی بد دُعا لگی ہے، جس کے بچے کو میں نے مارا ہے۔"

اُس کی امی بولیں۔ "بیٹا! اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر بہت مہربان ہے، جب انسان پہلی بار کسی غلط راستے کی طرف قدم اُٹھاتا ہے تو اُسے ٹھوکر ضرور لگتی ہے کہ وہ سنبھل جائے جو سنبھل جاتے ہیں وہ

ہدایت پا جاتے ہیں اور جو نہیں سنبھلتے پھر اللہ تعالیٰ اُن کو گمراہی میں پڑے رہنے دیتا ہے اور پھر آخر کار وہ جہنم کا ایندھن بن جاتے ہیں۔"

"مجھے بھی یہ چوٹ اِسی لیے لگی ہے کہ میں سنبھل جاؤں۔" امی کی بات ختم ہوتے ہی علی فوراً بولا۔

"جی بیٹا!" امی نے مختصر سا جواب دیا۔

"میں آئندہ کسی جانور اور پرندے کو تکلیف نہیں دوں گا۔" علی بولا۔

اُسے لان میں دوڑتا دیکھ کر اُس کی امی ابو اور بہن سب بہت خوش تھے۔ اس کا پلاسٹر کھلے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ کھیلتے ہوئے اچانک اُس کی نظر گھاس پر حرکت کرتی ہوئی کسی چیز پر پڑی۔ اُس نے جیسے ہی قریب جا کے دیکھا وہ چڑیا کا ایک ننھا سا بچہ تھا، جو اپنے گھونسلے سے گر گیا تھا، اُس نے چڑیا کا بچہ محبت سے اُٹھایا اور دوبارہ گھونسلے میں رکھ دیا۔

(پہلا انعام: 200 روپے کی کتب)

ننھی کلی

(صبیحہ حفیظ، حافظ آباد)

ننھی سفید کلی کا کھانس کھانس کر بُرا حال ہو رہا تھا سبھی! اُس کی اِس حالت سے پریشان تھے۔ اب تو باقی سب کو بھی ہلکی ہلکی کھانسی شروع ہو گئی تھی، لیکن سفید کلی کی حالت زیادہ ہی خراب تھی۔ ان سب کی کھانسی کی وجہ وہ زہریلا دھواں تھا جو پاس بیٹھے غفور کے سگریٹ سے بلند ہو رہا تھا۔

"گلاب چاچا! کیا آپ اِسے منع نہیں کر سکتے؟" سفید کلی نے کھانستے ہوئے کہا۔

"یہ میری سنتا ہی کہاں ہے؟ میری تو کیا یہ ہم میں سے کسی کی بھی نہیں سنے گا۔"

یہ گفتگو شہر کے معروف چوک میں پھولوں کے سٹال پر موجود پھولوں کے درمیان ہو رہی تھی۔

سفید کلی نے آج صبح ہی ایک باغ میں آنکھ کھولی تھی۔ ٹھنڈے اور خوش گوار ماحول نے اُس کا استقبال کیا تھا۔ کوئل کی کوک اور چڑیوں کی چہچہاہٹ اُسے بہت بھلی لگ رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ دِن کی روشنی پھیلنے لگی۔ کچھ دیر بعد چند آدمی باغ میں داخل ہوئے۔

انھوں نے پھولوں کو پودوں سے جدا کرنا شروع کر دیا۔ بے چارے پھول بہت چیخے چلّائے، لیکن وہ لوگ اپنے کام میں مصروف رہے۔ ان میں غفور بھی شامل تھا۔ غفور نے پھول لا کر کچھ اپنی دُکان میں سجائے اور کچھ باہر سٹال پر سجا دیئے۔ سفید کلی کو باہر سٹال پر جگہ ملی تھی۔

پھول سجانے کے بعد غفور سگریٹ پینے میں مصروف ہو گیا، جس کے دھوئیں سے سفید کلی کو کھانسی آنا شروع ہو گئی تھی۔ دوپہر کے وقت ایک چم چم کرتی گاڑی آئی، جس سے دو آدمی باہر نکلے۔ ایک تو ڈرائیور کے یونی فارم میں تھا، جب کہ دُوسرا نہایت قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ یہ شہر کے ایک بزنس مین سلطان کا بڑا بیٹا نعمان تھا۔ نعمان کے بڑے بھائی عدنان کی آج شادی تھی۔ وہ گاڑی کو پھولوں سے سجانے کے لیے غفور کے پاس آئے تھے۔ غفور نے نعمان سے کچھ بات کی اور پھر اپنے ملازم کے ساتھ گاڑی سجانے لگا۔ سفید کلی کے ساتھ گلاب کو بھی سجاوٹ کے لئے گاڑی پر لگا دیا گیا تھا۔

گلاب چاچا! کیا صبح کی طرح ایک دفعہ پھر ہم سفر کریں گے؟" سفید کلی نے پوچھا۔

"ہاں۔" گلاب کے پھول نے افسردگی سے کہا۔

ایک دفعہ پھر پھولوں کو گاڑیوں کے بے ہنگم شور اور

دھوئیں سے گزرنا پڑا۔ رات کے پچھلے پہر تک شادی کی شان دار تقریب جاری رہی، پھر گاڑی سے خوب صورت پھولوں کو اُتار کر ایک طرف پھینک دیا گیا۔ جن پھولوں نے گاڑی کی خوب صورتی کو چار چاند لگائے تھے۔ ایک دن کی زندگی

گزرانے کے بعد اب کوڑے کے ڈھیر میں افسردہ پڑے تھے۔

"گلاب چاچا! کیا ہم صبح کا سورج نہیں دیکھ سکیں گے؟" ننھی سفید کلی نے پوچھا۔

"شاید ایسا ہی ہو، مگر ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم انسانوں کے کام آئے ہیں، یہی ہماری زندگی کا مقصد تھا۔" گلاب کی یہ بات سن کر سفید کلی نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

تعلیم وتربیت سے انٹرویو

(صبا احمد، واہ کینٹ)

ایک دن مجھے خیال آیا کہ اگر اپنے اچھے دوست "تعلیم وتربیت" کا انٹرویو کیا جائے تو کتنا اچھا ہو گا۔ اس خیال کا اظہار میں نے تعلیم وتربیت سے کیا تو وہ پوچھنے لگا۔

"کیا آپ مجھے شوق سے پڑھتے ہیں؟"

میں نے کہا: "جی ہاں، آپ کو میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں، میرا دل چاہتا ہے کہ تعلیم وتربیت کا تازہ شمارہ روز ہی نکلے تو میں ایک دن میں ہی اسے پڑھ لوں۔"

تعلیم وتربیت نے فوراً کہا: "ایسا ہونا ممکن نہیں، آپ کو اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ میں ہر ماہ باقاعدگی سے معصوم بچوں کے پاس آرہا ہوں۔"

"جی ہاں! آپ نے درست کہا ہے۔"

اسی طرح کے کچھ اور سوالات بھی ہوئے میں تو بوکھلا گیا کہ میں تو "تعلیم وتربیت" کا انٹرویو لینے بیٹھا تھا، لیکن تعلیم وتربیت نے تو میرا انٹرویو لینا شروع کر دیا تھا، شاید اُس نے میری یہ پریشانی بھانپ لی اور بولا: "چلیے انٹرویو لیں۔"

میں: "جی کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

تعلیم وتربیت: "بہت اچھا ہوں، اللہ کا کرم ہے مجھ پر۔"

میں: "آپ خوش کب ہوتے ہیں؟"

تعلیم وتربیت: "جب بھی کوئی بچہ اپنے کسی دوست کو مجھے پڑھنے اور سنبھالنے کی تلقین کرتا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔"

میں: "آپ کو دکھ کب ہوتا ہے؟"

تعلیم وتربیت: جب آپ اور آپ جیسے ہزاروں معصوم بچے اپنی تحریریں مجھ میں نہ دیکھ کر دکھی ہوتے ہیں تو اِن معصوموں کو دیکھ کر میں بھی دکھی ہو جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کاش تم جیسے نونہالوں کو کوئی یہ سمجھائے کہ اِن کی تحریریں نہ چھپنے میں انہی کی بھلائی ہے۔"

میں: "ہماری اپنی ہی بھلائی، وہ کیسے؟"

تعلیم وتربیت: "جب آپ کی کوئی تحریر نہیں چھپے گی تو آپ اور زیادہ محنت کریں گے، خوب مطالعہ کریں گے اور یوں آپ کی تحریروں میں نکھار آجائے گا۔"

میں: "آپ کو بچوں سے کوئی شکایت ہے؟"

تعلیم وتربیت: "ہاں کچھ بچے مجھے پڑھتے ہیں اور پھر میری قدر نہیں کرتے اور مجھے ردی میں پھینک دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ علم کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ بچوں کو چاہیے کہ وہ مجھے سنبھال کر رکھیں، میرا تعارف دُوسروں سے بھی کروائیں، تاکہ زیادہ سے زیادہ علم کی روشنی پھیل سکے۔"

میں: "آپ اپنے ننھے دوستوں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟"

تعلیم وتربیت: "بچوں کو چاہیے کہ وہ علم حاصل کر کے ملک وقوم کا نام روشن کریں۔"

میں: "آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ نے انٹرویو کے لئے وقت دیا۔"

تعلیم وتربیت: "آپ کا بھی بہت شکریہ۔"

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

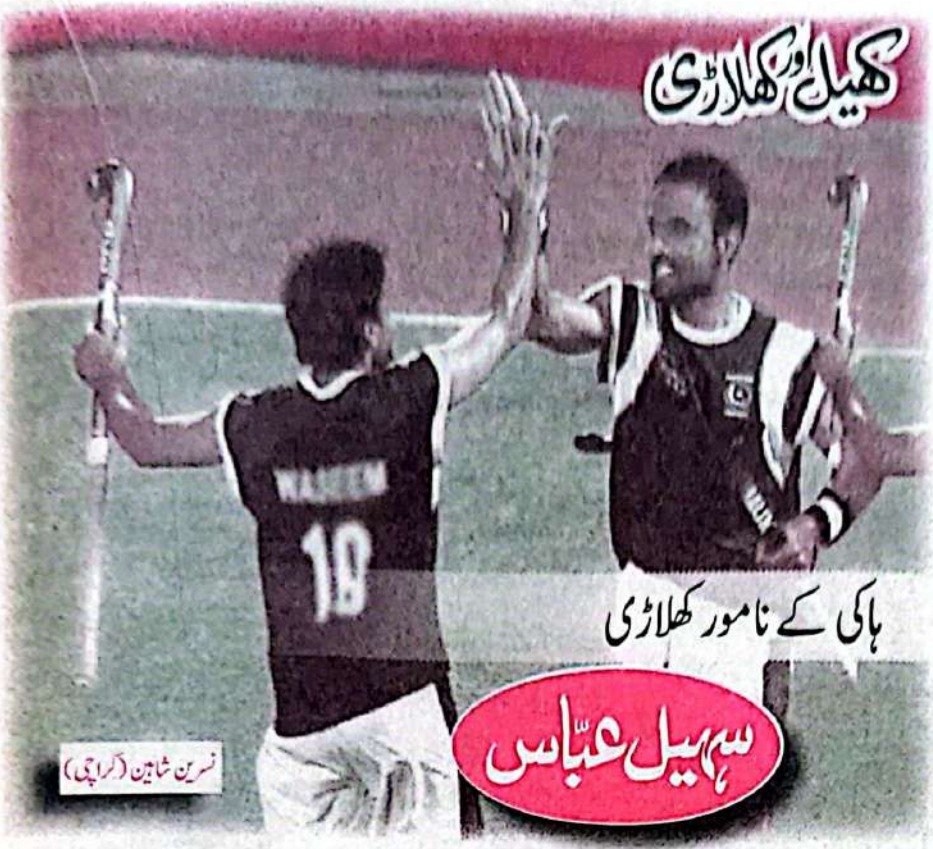

ہاکی کے نامور کھلاڑی

سہیل عبّاس

نسرین شاہین (کراچی)

قومی ہاکی ٹیم ایک مدت سے بڑا اعزاز حاصل نہیں کر سکی تھی، لاس اینجلس 1984ء کے بعد اولمپکس اور سڈنی 1994ء کے بعد ورلڈ کپ کے اعزازت جیتنا صرف سہانے سپنوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ اِس دوران ایک ایسے کھلاڑی نے قومی سطح پر اپنی پہچان کچھ اِس طرح سے کرائی کہ اب وہ زیادہ سے زیادہ گول کرنے کا عالمی ریکارڈ قائم کر چکا ہے۔ ہالینڈ کے مایہ ناز فل بیک پال لچن نے 177 میچوں میں 267 گول کر کے بظاہر نہ ٹوٹنے والا ریکارڈ بنایا تھا، لیکن ریکارڈز بنتے ہی ٹوٹنے کے لئے ہیں۔ اس ریکارڈ کو سہیل عباس نے بھارت کے خلاف امرتسر میں کھیلی جانے والی ہاکی سیریز میں اپنے کیریئر کے 217 ویں میچ میں پاکستان کی طرف سے 268 ویں بار گیند کچھ اس رفتار سے پھینکی کہ وہ گول کا جال پھاڑ کر دُوسری طرف نکل گئی تھی۔ اکتوبر 2004ء میں عالمی ریکارڈ قائم کرنے والے سہیل عباس کو عظیم کھلاڑی اور پینالٹی کارنر اسپیشلسٹ قرار دیا گیا تھا، اِسی عظیم کھلاڑی نے 6 دسمبر 2009ء میں اپنا ہی ریکارڈ توڑ کر 300 گول کر کے سب سے زیادہ گول کرنے کا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ یہ کارنامہ سہیل عباس یعنی پاکستانی پینالٹی کارنر اسپیشلسٹ نے ارجنٹائن میں چیمپئنز چیلنج ٹورنامنٹ میں کینیڈا کے خلاف میچ کھیلتے ہوئے انٹرنیشنل ہاکی میں 300واں گول کر کے سب سے زیادہ گول کرنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا اور یوں سہیل عباس دنیائے ہاکی میں سب سے زیادہ گول کرنے والے کھلاڑی بن گئے ہیں۔ انہوں نے یہ سنگ میل 318 میچز کھیل کر حاصل کیا۔ اِس طرح سہیل عباس نے اپنی شان دار کارکردگی سے ہاکی کی تاریخ میں منفرد کارنامہ انجام دیا۔ آپ درجن سے زائد عالمی ریکارڈز کے حامل کھلاڑی ہیں۔

سہیل عباس 9جون 1977ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ وہ تین بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔ انہوں نے ایسے متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی، جہاں اسپورٹس کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ ان کے والد سید افتخار حسین یوں تو کاروباری شخص تھے۔ تاہم اُن کا شمار کراچی کے جانے مانے کرکٹرز میں ہوتا تھا۔ وہ ظہیر عباس کے ساتھ کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ اس لیے سہیل عباس کا نام بھی ایشین بریڈ مین ظہیر عباس نے رکھا تھا۔

1973ء کے ورلڈ کپ میں ارجنٹائن کے خلاف گول کر کے شہرت حاصل کرنے والے صفدر عباس ان کے ماموں تھے۔ انہوں نے ہی سہیل کا داخلہ حبیب پبلک اسکول میں کروایا، جہاں ہاکی کو ایک مضمون کی حیثیت حاصل تھی، ورنہ اس سے پہلے سہیل عباس فاسٹ باؤلر محمد سمیع کے ساتھ کرکٹ کھیلتے تھے، انہوں نے حبیب پبلک اسکول میں ہاکی کھیلنا شروع کی تھی۔ شروع میں یہ فار ورڈ کھلاڑی تھے، لیکن کوچ

کے مشورے پر دفاعی کھلاڑی بن گئے۔

حبیب پبلک اسکول کراچی سے میٹرک کرنے کے بعد سہیل عباس نے ڈی جے کالج میں داخلہ لے لیا، لیکن تعلیمی سلسلے میں تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔ انہوں نے پرائیویٹ انٹر کرنے کے بعد جام شورو یونیورسٹی سے گریجویشن کی سند حاصل کی۔ وہ اسکول کے ہاکی ٹیم کے کپتان تھے۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی ٹیم بنی تو اُس کی کپتانی کے فرائض انجام دیئے۔ اپنے کالج کی ٹیم کے بھی کپتان رہے۔ ساتھ ہی انٹر کالجز کی ٹیم کی کپتانی کے فرائض بھی نبھائے۔ پھر علاقائی و ملکی سطح پر ہونے والے انڈر 16 اور انڈر 18 ٹورنامنٹس میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ کوئٹہ میں ہونے والی اٹھارویں جونیئر نیشنل ہاکی انڈر 18 چمپئن شپ میں انہوں نے سندھ کی نمائندگی کی۔ پھر انہیں جرمنی کے خلاف ہونے والی ہوم سیریز میں موقع ملا۔ اس عرصے میں ہوم گراؤنڈ پر ہونے والی سیریز میں نیشنل جونیئر ٹیم کی نمائندگی کا موقع ملا، لیکن غیر ملکی دوروں کے لیے سہیل عباس کو منتخب نہیں کیا جاتا تھا۔

1977ء میں نیشنل جونیئر ٹیم میں واپسی ہوئی اور انہوں نے جرمنی کے خلاف ہونے والی ٹیسٹ سیریز میں حصہ لیا، تاہم 97ء کے جونیئر ورلڈ کپ کے لیے انہیں منتخب کیا گیا۔ 1998ء میں انہوں نے پاکستان وائٹس کے ساتھ جنوبی افریقہ کا دورہ کیا، جہاں ان کی شان دار کارکردگی نے ساتویں پاک بھارت سیریز میں ان کی جگہ پکی کر دی۔ اُس وقت کے قوانین میں یہ سہولت تھی کہ کارنر کے وقت کھلاڑی بینچ سے اٹھ کر میدان میں اترے اور شارٹ مارنے کے بعد واپس چلا جائے۔ سہیل عباس کا کردار بھی کچھ اِسی قسم کا تھا۔ 98ء میں قوانین تبدیل ہوئے اور یہ طریقہ کار ختم کر دیا گیا۔ اِسی کے باعث انہیں کامن ویلتھ گیمز کھیلنے والی ٹیم میں منتخب نہیں کیا گیا، لیکن انہوں نے محنت جاری رکھی، جس نے جلد ہی انہیں چیمپئنز ٹرافی کھیلنے والی ٹیم کا حصہ بنا دیا۔ اس ٹورنامنٹ کے بعد تو وہ پاکستانی ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے، اور پھر کام یابیوں کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا جو انہیں شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔ تمام عالمی ریکارڈز ان کی کارکردگی کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔

سہیل عباس نے 1998ء میں 20 گول اسکور کیے۔ 1999ء

میں وہ اپنے کیریئر کے عروج پر تھے۔ اس سال انہوں نے 60 گول اسکور کیے، اور یوں کیلنڈر ائیر میں سب سے زیادہ گول کرنے کا ریکارڈ ان کے حصے میں آیا۔ آٹھویں پاک بھارت سیریز میں انہوں نے 10 گول کیے، نویں اذلان شاہ کپ میں انہوں نے 12 گول اسکور کیے۔ پانچویں ایشیا کپ میں ان کے

گولز کی تعداد 16 رہی۔ جس میں سری لنکا کے خلاف ڈبل ہیٹ ٹرک بھی شامل تھی۔ 2000ء کے اولمپک گیمز میں وہ سب سے زیادہ گول کرنے والے کھلاڑی تھے۔ پاکستان کی جانب سے بین الاقوامی ہاکی میں سب سے زیادہ گول کرنے کا حسن سردار کا قائم کردہ ریکاڈر توڑا۔ تیرہویں اذلان شاہ کپ میں سہیل عباس سب سے زیادہ گول اسکور کرنے والے کھلاڑی تھے۔ اِس ٹورنامنٹ میں انہوں نے جرمنی اور انڈیا کے خلاف ہیٹ ٹرک کی، اس سال ان کے گولز کی کُل تعداد 59 رہی۔ 2005ء میں سہیل عباس کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کا حصہ بنا۔

دسمبر 2004ء میں ہونے والی چیمپئنز ٹرافی کے بعد انہوں نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کا اعلان کرتے وقت سہیل عباس نے کہا تھا کہ جب ٹیم کو میری ضرورت ہو گی، میں حاضر ہو جاؤں گا۔ یہی وجہ ہے کہ 2006ء میں جب فیڈریشن نے بلایا تو وہ ایک بار پھر ٹیم کا حصہ بن گئے۔ ان کی ڈیپارٹمنٹل ہاکی کا آغاز حبیب بینک کی ٹیم سے ہوا، بعد ازاں وہ مسلم کمرشل بینک، واپڈا اور سوئی سدرن گیس کے محکموں کی ہاکی ٹیموں میں کھیلتے رہے۔ اپنے عمدہ کھیل کے باعث وہ ہمیشہ بین الاقوامی ہاکی کلبوں کی توجہ کا مرکز رہے۔ 99ء میں انہوں نے کچھ عرصہ ڈچ ہاکی کلب "Amsterdam" کی نمائندگی کی۔ 2002ء میں انہیں ملائیشیا کے کلب بی ایس این سے کھیلنے کا موقع ملا۔ آپ نے جرمن کلب کی بھی نمائندگی کی اور پھر ڈچ لیگ کھیلنے کا موقع بھی ملا۔ 2005ء میں انہوں نے ہندوستانی کلب حیدر آباد سلطان کی نمائندگی کی۔ پھر وہ ڈچ کلب Rotterdam کا حصہ بن گئے۔ وہ ہالینڈ میں کوچنگ بھی کرتے رہے۔

سہیل عباس دُنیا کے واحد کھلاڑی ہیں جنہیں ایک ڈبل ہیٹ ٹرک اور 21 ہیٹ ٹرک کرنے کا منفرد اعزاز حاصل ہے۔ گولز کی تیز ترین سنچری اور ڈبل سنچری کا سنگ میل عبور کرنے کا ریکارڈ بھی انہی کے پاس ہے۔

☆☆

یہ ہے

بچّوں کی دُنیا

ایسی دُنیا کا احوال جہاں بچّوں کا راج تھا

وقار محسن (کراچی)

بھلا چھٹیوں کے دن بھی اس لئے ہوتے ہیں کہ پوری دوپہر نیم تاریک کمرہ میں اے سی کی سیں..... سیں سنتے گزار دیئے جائیں، جب کہ باہر دھانی، کاسنی، ہری سرخ پتنگیں ہوا میں سرسرا رہی ہوں۔ تتلیاں باغ میں پھولوں کی پتیوں کی طرح ناچ رہی ہوں اور چندو مالی کے بچے مولسری کے درخت کے نیچے اندھا بھینسا کھیل رہے ہوں۔ ہائے پکے آم اور بیری کے بیر ٹپاٹپ گر رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر امان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ دادی کی آنکھ لگتے ہی امان نے اپنے چھوٹے بھائی ایان اور ایزان کو شی، شی کر کے اشارہ کیا اور تینوں بھائی دبے پاؤں باغ میں آ گئے۔

"امان بھائی،،، امان بھائی، مالی بابا کہہ رہے تھے کہ درخت پر چڑیا نے انڈے دیے ہیں، جن میں سے ایزان جیسے ننھے ننھے چوزے چونچ نکال رہے ہیں۔" ایان نے خوشی سے ناچتے ہوئے خبر دی۔ امان نے ایان کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر درخت پر چڑھا دیا۔ چڑیا کے بچوں کو نرم گھاس پر رکھنے کے بعد تینوں بھائی سر جوڑ کر سوچنے لگے کہ کس طرح ان پھول جیسے بچوں کو دھوپ اور لُو سے بچایا جائے۔

"امان بھائی! ان کو فریزر میں رکھ دیں؟" ایزان نے مشورہ دیا۔

"نہیں ننھے! وہاں پھر ان کے لئے رضائی کا بھی بندوبست کرنا پڑے گا۔" امان نے سمجھایا۔

"میرا خیال ہے جھاڑیوں کے پیچھے جو کنواں ہے، جس کا پانی سوکھ گیا ہے وہ سب سے محفوظ اور ٹھنڈی جگہ ہے۔"

ایان کا یہ مشورہ سب کو پسند آیا۔ تینوں بھائی بہت مشکل سے چندو مالی کی کوٹھری کے پیچھے سے بانس کی سیڑھی گھسیٹ کر لائے اور سیڑھی کنویں میں اتار دی۔ سب سے پہلے امان آہستہ آہستہ سیڑھی سے نیچے اترے، ان کے پیچھے ایان اور ایزان بھی آ گئے۔ درخت کی ایک سوکھی لکڑی سے تینوں نے مٹی کھودنا شروع کی تاکہ چڑیا کے بچوں کو نرم مٹی میں لٹایا جاسکے۔ تھوڑی دیر بعد ایان کی حیرت بھری آواز اُبھری۔

"امان بھائی! امان بھائی..... اِدھر آئیں یہ دیکھیں، یہاں ایک زینہ اندر جا رہا ہے۔"

"نا امان بھائی نا..... نیچے مت جانا، شاید یہ پہلے دیو کا گھر ہو۔" ایزان نے امان کا ٹیکر پکڑ کر کہا۔

"ننھے! یہ دیو اور پریوں کی کہانیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔" امان نے تسلی دی اور تینوں بھائی پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگے۔ کچھ دُور تو اندھیرا رہا اور یہ تینوں ٹٹول ٹٹول کر نیچے اترتے رہے، لیکن نیچے جا کر روشنی نظر آنے لگی۔ پچاس ساٹھ سیڑھیاں اتر کر جب یہ لوگ روشنی میں آئے تو ایک نئی دنیا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ چاروں طرف بچے ہی بچے نظر آ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر چند بزرگ حضرات پتنگ اڑاتے، گلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کچھ باریش صاحبان نیم کے درخت کے نیچے ہل ہل کر الف زبر آ کے نعرے لگا رہے تھے اور ان کے نزدیک کھڑا ایک بچہ اُن کو سمجھا رہا تھا۔

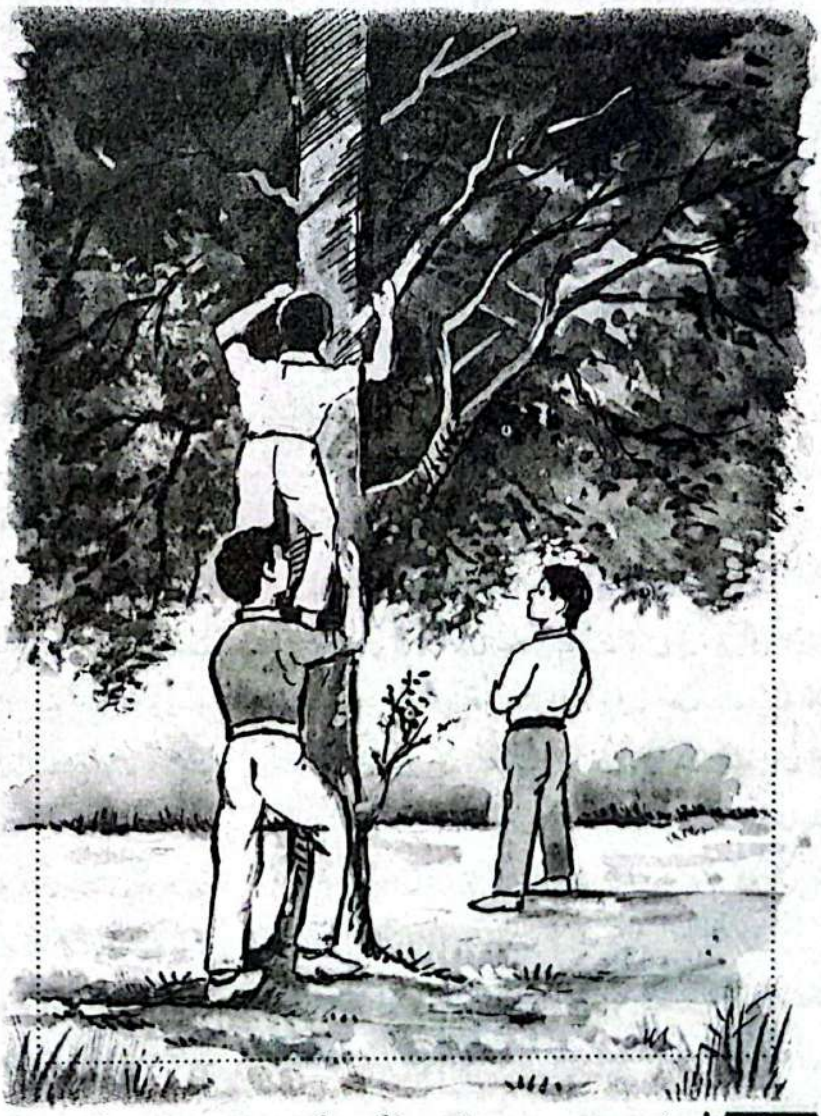

"خالو میاں! آپ سے کتنی بار درخواست کی ہے کہ انگلی رکھ کر سبق یاد کیا کریں۔ آپ کو علم ہے کہ آپ کے نواسے ابرار کی سفارش پر آپ کو ایلڈر گارڈن اسکول میں داخلہ ملا ہے۔"

"اچھا گڈو میاں! پہلے آپ ہمیں لالی پاپ دیں پھر ہم سبق یاد کریں گے۔" خالو میاں مچل گئے۔

سامنے کیلے کے پتوں اور گیندے کے پھولوں سے سجا ہوا ایک بہت بڑا گیٹ تھا، جس پر سنہرے حروف میں لکھا تھا "بچوں کی دُنیا" امان ایان اور ایزان کو دیکھتے ہی بے شمار بچے خوش آمدید کہتے ہوئے ان کی طرف لپکے۔ ہر بچہ ضد کر رہا تھا کہ یہ تینوں اُس کے مہمان ہیں۔

"تمہارے ہاں کہیں پولیس کیوں نظر نہیں آ رہی؟" امان نے ایک بچے سے پوچھا۔

"کیوں؟ پولیس کا یہاں کیا کام؟" بچے نے تعجب سے پوچھا۔

"ارے بھئی چوری کی روک تھام کے لئے۔"

"یہ چوری کیا ہوتی ہے؟"

"کھانے پینے کی چیزوں اور ادویات میں ملاوٹ کرنے والوں کو کون پکڑتا ہے؟"

"یہ ملاوٹ کس چڑیا کا نام ہے؟"

"اور ٹریفک کون کنٹرول کرتا ہے؟"

"ارے میاں! لوگوں کے حقوق کی کون حفاظت کرتا ہے؟"

"خود لوگ۔"

"تو یہاں چوری ڈکیتی، فریب، دھوکہ، قتل وغیرہ کچھ نہیں ہوتا؟" ایان نے تعجب سے پوچھا۔

"معلوم نہیں آپ کون لوگ ہیں اور کس دُنیا کی بات کر رہے ہیں۔

پیارے دوستو! ہمارے یہاں تو بس پھول ہوتے ہیں، باغ ہوتے ہیں، خوش بو ہوتی ہے، چڑیاں ہوتی ہیں اور پیار ہوتا ہے۔" نیلی آنکھوں والے بچے نے مسکرا کر کہا۔

سڑک کے دونوں طرف رنگ برنگے پھولوں کی قطاروں کے ساتھ ٹافیوں، پھلوں، میووں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ درخت کی شاخوں پر سنہری بالٹیاں لٹکی ہوئی تھیں جو کون، قلفی اور پستہ آئس کریم سے لبریز تھیں۔

"پیارے دوست! کیا آپ ہمیں اپنے اسکول دکھائیں گے؟" ایزان نے درخواست کی۔

"ضرور..... ضرور....." میزبان ایک زبان ہو کر بولے اور تینوں مہمانوں کو لے کر ایک خوب صورت عمارت میں پہنچے، جہاں کلاسوں میں پچاس سال سے ستر سال کے بزرگ طلباء پڑھائی میں مشغول تھے۔ پہلے یہ لوگ درجہ اوّل کے سامنے رکے، جہاں ایک آٹھ سالہ استاد صاحب پہاڑے یاد کرا رہے تھے۔ سب سے پیچھے بینچ پر بیٹھے ایک بزرگ کاپی پر استاد کا کارٹون بنا رہے تھے۔ دُوسرے صاحب چپکے چپکے بٹوے سے چھالیہ اور سونف نکال کر نوش فرما رہے تھے۔

"ٹوپی والے صاحب! آپ بتائے! چار چوکے کتنے ہوتے ہیں؟" اچانک ماسٹر صاحب نے ایک بزرگ سے سوال کیا، جو ڈیسک کے نیچے منہ کر کے بلی کی آواز نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"چالیس..... ہی ..... ہی ..... یا شاید..... تیس" ان صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"جناب امجد صاحب! نہایت افسوس کی بات ہے کہ آپ پڑھائی کی طرف بالکل بھی توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ ہوم ورک کی کاپی پر بھی آپ جگہ جگہ پان کی پیک کے دھبے لگا لائے ہیں۔" ننھے ماسٹر صاحب نے افسوس کا اظہار کیا۔

"اچھا شیخ نواب جان صاحب! آپ بتائیں۔ اگر آپ کی ڈبیہ میں چار پان ہیں اور اس میں سے دو پان حمید صاحب کو دے دیے تو کتنے پان رہ جائیں گے؟" ننھے ماسٹر صاحب نے سوال کیا۔

"کیا فرمایا آپ نے؟ حمید صاحب کو تو میں پان ہرگز نہیں دے سکتا۔ کل شام وہ نکڑ کے ٹھیلے پر آلو کی چاٹ کھا رہے تھے انہوں نے مجھے پوچھا تک نہیں۔ ویسے جمع کے سوال آوٹ آف کورس ہیں اسی لئے میں نے ابھی تک نہیں سیکھے۔"

"ماشاء اللہ! تو کیا یہ جمع کا سوال تھا؟" ماسٹر صاحب نے سر پکڑ کر کہا۔

دھوپ ڈھل رہی تھی اور سورج کی کرنوں نے درختوں پر سونا پھیلا دیا تھا۔ اگلا پروگرام کھیل کے میدان کی طرف جانے کا تھا۔ تینوں بھائی تھک گئے تھے، اس لئے امان کو ایک ہنس نے اپنے پروں پر بٹھا لیا تھا، ایان نے ایک زیبرے کی سواری گانٹھ رکھی تھی اور ایزان شتر مرغ کی پیٹھ پر سوار ہو گئے۔

بچوں کی دُنیا کا کھیل کا میدان دیکھ کر تینوں بھائی حیران رہ گئے۔ میلوں تک ہری ہری گھاس قالین کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اودے، گلابی، نارنجی، چمپئی رنگ کے پھولوں کی جھاڑیوں کے گرد بچے، خرگوش، مور، ہرن اور چڑیاں کوڑا جمال شاہی، اکڑ بکڑ، بول میری مچھلی کتنا پانی اور اندھا بھینسا کھیل کھیلنے میں مصروف تھے۔ ندی کے کنارے بے شمار بچے ایک دُوسرے کا ہاتھ پکڑے دائرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ دائرے کے اندر ایک چیتے کا بچہ آنکھوں پر پٹی باندھے چپت مارنے والے بچے کی طرف بڑھتا۔ جس بچے کے ہاتھ لگ جاتا پھر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی۔

میدان کے ایک حصے میں کچھ بچوں نے دھنک کو رسی کی شکل دے رکھی تھی اور دونوں سروں پر دو ہاتھی رسی کو سونڈ سے پکڑے گھما رہے تھے اور بے شمار بچے اور جانور کلکاریاں مارتے ہوئے رسی کود رہے تھے۔ سارس نے بانسری پر کوئی میٹھی سی دھن چھیڑ دی تھی اور اس کے درمیان کوئل کی سُریلی آواز سن کر ایان نے امان سے پوچھا۔

"امان بھائی! کل جو دادی اماں جنت کے بارے میں بتا رہی تھیں وہ سب کچھ ایسا ہی تو تھا جو ہمارے سامنے ہے۔ کیا ساری دُنیا اس بچوں کی دُنیا کی طرح نہیں بن سکتی، جو نفرت، دشمنی، خود غرضی اور مکر و فریب سے پاک ہو۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو دُنیا جنت بن جائے گی۔" امان نے جواب دیا۔

خواب سے تعبیر تک

علی اکمل تصور (قصور)

خواب وہ نہیں ہوتا جو ہم سوتے میں نیند کی حالت میں دیکھتے ہیں، خواب وہ ہوتا ہے جو ہمیں سونے نہیں دیتا۔ کچھ حاصل کرنے کی خواہش کچھ پانے کا جنون ہم سے ہمارا آرام اور سکون چھین لیتا ہے۔ زندگی اس جنون کے سامنے بے قیمت ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور پھر خواب سے تعبیر تک کا سفر شروع ہوتا ہے۔ کامل خیالی نے بھی ایک ایسا ہی خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور اب وہ تعبیر کے سفر پر چل نکلا تھا۔

یہ گزرے سال کی بات ہے۔ دسمبر کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ کامل خیالی کو ایک پُر وقار تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ تقریب شعبہ بچوں کا ادب کے زیرِ اہتمام لاہور میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کا مقصد بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ کامل خیالی کے علاوہ ملک بھر سے بچوں کے ادیب یہاں موجود تھے۔ کامل بہت خوش تھا۔ وہ اس میدان میں ابھی نو آموز تھا۔ سینئر لکھاریوں سے ملاقات سے اس کا فن نکھر سکتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی فن کی صلاحیت اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ صلاحیت کو پیدا نہیں کیا جاسکتا، ہاں اُسے نکھارا ضرور جاسکتا ہے۔ لکھنے کی صلاحیت اللہ نے کامل کو عطا کی تھی۔ اب وہ نکھرنے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ ابھی اُس کی چند تحریریں ہی رسائل میں شائع ہوئی تھیں اور اسے اس ہم تقریب میں مدعو کر لیا گیا تھا۔ تقریب تین گھنٹے تک جاری رہی تھی۔ اس دوران کامل خیالی نے لکھنے کے حوالے سے بہت سے اہم نکتے نوٹ کیے تھے۔ اسے پورا یقین تھا کہ اب وہ جو کچھ لکھے گا وہ پہلے سے بہتر ہو گا۔ اب تقریب کا آخری مرحلہ تھا۔ اس مرحلے میں سال بھر میں جس ادیب نے سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ پُر اثر لکھا تھا۔ اُسے سال کے بہترین ادیب کے طور پر ایوارڈ سے نوازا جانا تھا۔ سٹیج پر موجود کمپیئر اس ادیب کے نام کا اعلان کرنے والا تھا۔ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی ایک معروف سماجی، علمی اور ادبی شخصیت تھی۔ وہ ہاتھوں میں ایوارڈ پکڑے اُس خوش نصیب ادیب کے منتظر تھے، جسے آج اُس کے فن کے حوالے سے خصوصی عزت ملنے والی تھی۔ کمپیئر کی آواز میں جوش تھا۔ ہال میں خاموشی تھی۔ تمام ادیبوں کے دلوں نے ایک لمحے کے لیے جیسے دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ سب کے کان اُس نام کو سننے کے منتظر تھے، جو آج محفل کی جان بننے والا تھا۔ کمپیئر ان لمحات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جوشیلے لہجے میں بولا۔

"دوستو! اس سال کے بہترین ادیب ہیں..... جناب....."

چند لمحوں کے مزید توقف کے بعد کمپیئر نے بلند آواز میں ایک نام پکارا۔ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ایک عجب شادمانی کی کیفیت تھی۔ ایک نوجوان اپنی منزل کے حصول کے لیے

سٹیج کی طرف بڑھا۔ راستے میں دوست احباب اُسے مبارک باد دے رہے تھے۔ چند لمحوں میں وہ سٹیج پر پہنچ گیا۔ مہمانِ خصوصی نے مسکراہٹ کے ساتھ اُس کا استقبال کیا اور چمکتا دمکتا ایوارڈ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ کیمروں کے فلش چمکے اور وہ لمحہ لافانی ہو گیا۔

ان چمکتی روشنیوں میں کامل خیالی نے جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھا۔ سال کے بہترین ادیب کا ایوارڈ کامل خیالی وصول کر رہا تھا۔ ایک پُر عزم مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر دوڑ گئی۔ اگلے سال یہ ایوارڈ میرا ہو گا۔ اُس نے زیرِ لب جیسے خود کو مخاطب کیا اور پھر یہیں سے منزل کی طرف سفر کا آغاز ہوا۔ ایسا سفر جو آسان نہیں تھا۔ کامل خیالی کے دل اور دماغ کے ساتھ ساتھ اُس کی زندگی میں بھی طوفان آگیا تھا۔ اپنے اِردگرد کے ماحول پر اُس کی نظر مزید گہری ہو گئی تھی۔ کسی بھی ادیب کا سب سے بڑا ہتھیار اُس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اُس کے گردوپیش ہونے والی باتیں اور واقعات اُسے کوئی ایسا نکتہ دے جاتے ہیں، جس کی مدد سے کہانی بُنی جا سکتی ہے۔ اگلا مرحلہ کہانی بیان کرنے کا ہوتا ہے۔ ایک اچھا ادیب عام سی بات کو منفرد اسلوب میں بیان کر کے ایک اچھی کہانی تخلیق کر سکتا ہے۔ کامل خیالی کے پاس ایک ڈائری تھی، وہ اس ڈائری میں ہر وہ منفرد بات لکھ لیتا تھا، جس کی مدد سے کہانی لکھی جا سکتی تھی۔ مرکزی خیال کو پُر اثر انداز میں بیان کرنے کے لیے وہ واقعات کے تانے بانے بُنتا تھا اور پھر رات کی خاموشی میں وہ لکھنے بیٹھ جاتا تھا۔ کبھی تو ساری رات ایک کہانی لکھنے میں تمام ہو جاتی تھی۔ اگلے دن نیند اور سر میں درد کی وجہ سے اُس کے روز مرہ کے کام ادھورے رہ جاتے تھے۔ اُس کی تعلیم بھی متاثر ہو رہی تھی اور گھریلو ذمہ داریاں بھی۔

اُس کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ بچوں کے مختلف رسائل میں ہر ماہ اس کی چار سے پانچ تحریریں شائع ہونے لگی تھیں۔ رسائل کی طرف سے تعریف بھرے خطوط اور فون کالیں بھی آنے لگی تھیں۔ یہ کام یابیاں اُس کی زندگی کے دُوسرے معمولات میں ناکامیوں کا باعث بن رہی تھیں۔ سالانہ امتحان میں اُس کے بہت کم نمبر آئے تھے۔ امی ابو اُس کا جنون دیکھ کر پریشان رہنے لگے تھے۔ وہ گھر کا کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بس وہ سوچتا اور لکھتا رہتا تھا یا پھر جاگتی آنکھوں سے اُس لمحے کا خواب دیکھتا رہتا تھا، جس میں وہ سال کے بہترین ادیب کا ایوارڈ ہاتھوں میں لیے بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔

کامل کے ابو کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی۔ وہ محلے میں موجود ایک ڈاکٹر سے دوا لیتے تھے، لیکن مرض بڑھتا جا رہا تھا۔ رات کو ان کے بائیں بازو میں درد ہوتا اور سانس لینے میں بھی تکلیف ہوتی۔ ڈاکٹر نے ہسپتال جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اپنی تکلیف کے پیشِ نظر ایک دن وہ کامل کے ہم راہ ہسپتال گئے۔ ڈاکٹر نے دس منٹ تک ان کے مرض کے حوالے سے ان سے گفتگو کی اور پھر ٹیسٹ لیا۔ نتیجہ پریشان کرنے والا تھا۔ اس کے ابو کو دل کا عارضہ تھا۔ ڈاکٹر نے دوا تجویز کر دی اور انہیں بوجھ اٹھانے سے منع کر دیا۔

اس کے ابو اجرت پر مزدوری کرتے تھے۔ مزدوری کی حالت میں بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ ابو کے دل میں کامل کے حوالے سے بھی پریشانی موجود تھی۔ کامل اُس راستے پر چل نکلا تھا جو تعریف کے قابل تو تھا، لیکن ابو نے کامل کے لیے کوئی اور منزل سوچ رکھی تھی، ایسی منزل جو ان سب کے مستقبل کو محفوظ بنائے۔ کامل نے امتحان میں کام یابی تو حاصل کر لی تھی، لیکن اُس کے نمبر اتنے کم تھے کہ کسی اچھی جگہ نوکری کا ملنا ناممکن تھا۔

دسمبر کا مہینہ چل رہا تھا۔ کامل خیالی کو ایک مرتبہ پھر شعبہ بچوں کا ادب کی طرف سے تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ کامل بے تابی سے اُس دن کا انتظار کر رہا تھا، جس دن اسے روانہ ہونا تھا۔ روانگی میں ابھی دو دن باقی تھے۔ ایک رات امی کامل کے پاس آئیں تو اُن کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"مت جاؤ بیٹا! یہاں ہمیں تمہاری ضرورت ہے....."

"امی! میں نے اتنی محنت کی ہے اور اب جب میں اپنی منزل کے اتنے قریب پہنچ چکا ہوں، آپ مجھے روک رہی ہیں....." کامل کی آواز میں درد تھا۔

"بیٹا! اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو صلاحیت دی ہے ہم اُس کی قدر کرتے ہیں۔ قلم کے ذریعے معصوم بچوں کی کردار سازی کرنا معمولی بات نہیں، یہ تو ایک نیکی ہے۔ اور ہم تم پر فخر کرتے ہیں، لیکن تم نے فراموش کر دیا کہ ہمارا بھی تم پر حق ہے۔ تم ضرور لکھو، لیکن توازن کے ساتھ ..... تمہارے ابو کی طبیعت خراب ہے۔ تمہاری غیر موجودگی میں اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی....."

"امی! آپ حوصلہ رکھیں، کچھ نہیں ہو گا صرف ایک دن اور ایک رات کے بعد میں واپس آجاؤں گا، امی اس ایوارڈ کے حصول کے بعد میں ہر کام توازن کے ساتھ کروں گا، ابھی مجھے جانے دیجئے۔" یہ سن کر امی ایک سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔

کامل کی مثال اُس چراغ جیسی تھی، جو اپنی لو سے ماحول کو تو روشنی دیتا ہے، لیکن اپنے نیچے کا اندھیرا کبھی نہیں مٹا پاتا۔ دو دن گزر گئے اور پھر کامل اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ کامیابی اُس کا مقدر ہے۔ ایک سال کے دوران اُس کی پچاس کے قریب تحریریں شائع ہو چکی تھیں۔ تقریب شروع ہونے سے آدھ گھنٹہ پہلے کامل ہال میں پہنچ گیا۔

انتظامیہ نے اس کا پُر جوش استقبال کیا۔ سب اُسے بچوں کے ادب کا سرمایہ کہہ رہے تھے۔ اُسے یہاں جو عزت مل رہی تھی، وہ اُس کی توقع سے بھی زیادہ تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اُس نے جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھا تھا، وہ بس اُس کی تعبیر پانے کو ہے۔ پھر اس پُر وقار تقریب کا آغاز ہوا۔ تمام چہرے وہی تھے جو پچھلے سال کامل نے دیکھے تھے، لیکن اب ان چہروں پر کامل کے لیے آشنائی کی چمک موجود تھی۔ پچھلے سال کامل کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اب کامل کے کام کے حوالے سے سب اُسے جانتے تھے۔ چند دوستوں نے تو دبے لفظوں میں کامل سے کہہ بھی دیا تھا کہ تیار ہو جاؤ اس سال بہترین ادیب تم ہی ہو۔ کامل کی آنکھوں میں روشن ستارے رقص کر رہے تھے۔ یہ لمحات بہت مسرت بھرے تھے، پھر وہ لمحہ آگیا، جس کے لیے کامل نے سارا سال انتظار کیا تھا۔ سٹیج پر موجود کمپیئر سال کے بہترین ادیب کے نام کا اعلان کرنے والا تھا۔ کامل کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اُسی وقت کامل کی جیب میں موجود موبائل تھرتھرایا۔ اُس نے موبائل کی آواز بند کر رکھی تھی۔ کامل نے دیکھا۔ یہ امی کا فون تھا، لیکن کامل کی مجبوری

تھی کہ وہ فون نہیں سن سکتا تھا۔ کمپیئر پُر جوش انداز میں کہہ رہا تھا۔

"ہمارے درمیان وہ نوجوان ادیب موجود ہے، جس نے ایک سال ہی میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ وہ لکھنے پر آیا تو ایسا لکھا کہ کمال کر دیا۔ سال کے بہترین ادیب قرار پائے ہیں..... جناب کامل خیالی۔"

کامل کا موبائل فون تھرتھرانا بند ہو گیا تھا۔ خوشی کی شدت سے کامل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اُس نے جو چاہا تھا وہ پا لیا تھا۔ مہمانِ خصوصی کے ہاتھوں میں ایوارڈ موجود تھا۔ اب پھر کامل کا موبائل تھراتھرانے لگا تھا۔ کامل سٹیج کی طرف قدم اُٹھانے لگا۔ جانے کیوں اُس کے قدم بھی تھرتھرا رہے تھے۔ اُس کے ساتھی اُسے مبارک باد دے رہے تھے۔ کامل سٹیج پر پہنچ گیا تھا۔ ان لمحات میں کامل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ مہمانِ خصوصی نے ایوارڈ دیتے ہوئے کہا۔

"مبارک ہو بیٹا!" کیمروں کے فلش چمکے اور کامل نے اپنی منزل پالی۔ خوشی کی شدت سے کامل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ کامل کی جیب میں موجود موبائل پھر سے تھرتھرانے لگا تھا۔ کامل کے ایک ہاتھ میں ایوارڈ تھا۔ اُس نے دُوسرے ہاتھ سے موبائل جیب سے نکالا۔ یہ امی کی فون کال تھی۔ کامل نے بٹن دبایا اور موبائل کان سے لگا لیا۔

"امی! میں نے کامیابی حاصل کر لی....." کامل خوش ہوتے ہوئے بولا، لیکن دُوسرے ہی لمحے وہ کانپ کر رہ گیا۔ امی رو رہی تھیں۔

"میرے بچے تم جیت کر بھی ہار گئے، تمہارے ابو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ آخری وقت میں تمہیں یاد کر رہے تھے۔ اگر تم وقت پر لوٹ آئے تو ٹھیک، ورنہ جو پڑوسی انہیں ہسپتال لے کر گئے تھے وہ قبرستان تک بھی انہیں کندھا دے دیں گے....." یہ سن کر کامل کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اُس کے ہاتھ میں موجود ایوارڈ اچانک ہی بہت وزنی ہو گیا تھا۔ دیکھنے والے سمجھ رہے تھے کہ اُس کی آنکھوں میں آئے آنسو خوشی کے ہیں، لیکن ان آنسوؤں کی حقیقت کیا تھی، یہ تو صرف کامل ہی جانتا تھا۔ پھر کامل واپس لوٹ آیا۔ ابھی اُسے اپنے ابو کے جنازے کو کندھا بھی دیتا تھا۔ کامل اب بھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے، لیکن اب وہ ایسے خواب دیکھتا ہے جن کی تعبیر پانے کی کوشش میں دُوسروں کے خواب ٹوٹ نہ جائیں۔

☆☆

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

☆ اچھی اور میٹھی بات بھی صدقہ ہے۔

☆ سب سے اچھا انسان وہ ہے جس کی زبان سے دُوسروں کو فائدہ پہنچے۔

☆ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دُوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

☆ مومن وہ ہے جو کبھی جھوٹ نہ بولے۔

☆ جس نے اپنے بھائی کو سلام کیا، وہ سلام کا پھیلانے والا ہے۔

☆ ماں باپ کو ایک بار شفقت کی نظر سے دیکھنے پر مقبول حج کا ثواب ملتا ہے۔

☆ ایک عابد عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے کہ چاند کی فضیلت دُوسرے تمام ستاروں پر۔

☆ آپس میں تحائف کا رواج عام کرو، محبت بڑھے گی۔

☆ ہمیشہ سچ اور حق بات کہو اگرچہ ناخوش گوار اور کڑوی ہو۔

(محمد مشتاق حسین، کراچی)

تاریخی ورثہ

قلعہ روہتاس

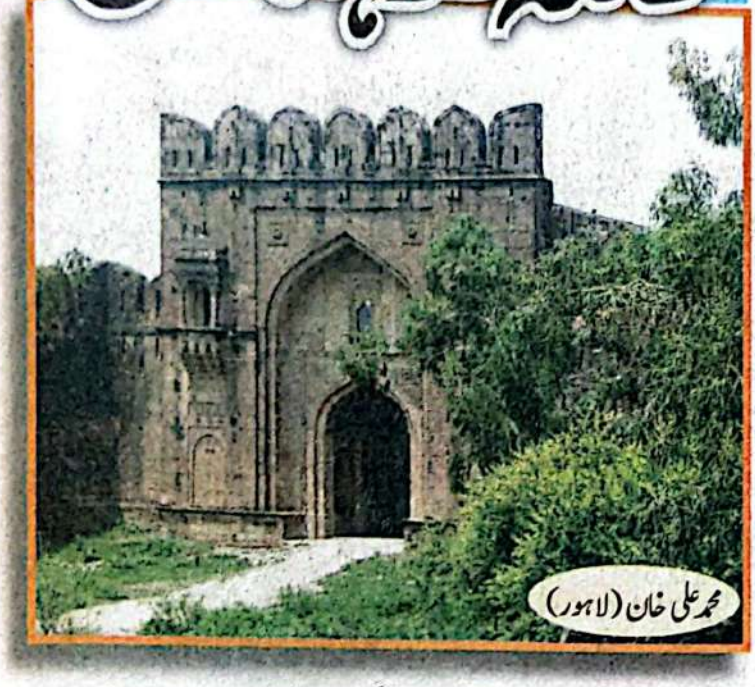

محمد علی خان (لاہور)

لاہور سے راول پنڈی براستہ جی ٹی روڈ سفر کرتے ہوئے جہلم شہر سے آگے نکلیں تو پندرہ سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قصبہ واقع ہے، جسے دینہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ دینہ سے شمال کی طرف جی ٹی روڈ کے دائیں ہاتھ ایک سڑک نکلتی ہے۔ جو منگلا ڈیم اور میر پور آزاد کشمیر کی طرف جاتی ہے اور جنوب کی طرف یعنی بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی سڑک سات آٹھ کلومیٹر پر واقع قلعہ روہتاس سے رابطہ قائم کرتی ہے۔

یہ تاریخی قلعہ مشہور پٹھان بادشاہ شیر شاہ سوری کی یادگار ہے، جس نے صرف پانچ سال برصغیر پر حکومت کی اور اس مختصر دورِ حکومت میں بنگال سے پشاور تک جی ٹی روڈ تعمیر کروائی اور اِس سڑک پر لاتعداد درخت لگوائے، سرائیں بنوائیں اور ڈاک کی چوکیاں قائم کیں۔ شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد جب مغل شہنشاہ ہمایوں نے ایران میں پناہ لی تو شیر شاہ نے اِس علاقے میں ایک قلعہ تعمیر کرنے کا ارداہ کیا، تاکہ اگر ہمایوں واپسی کا ارادہ کرے تو اُسے یہیں پر روک لیا جائے۔ اس قلعے کی تعمیر کا مقصد یہاں کے سرکش قبائل کی سرکوبی تھا، جو ہمایوں کے وفادار اور شیر شاہ کے مخالف تھے۔ چناں چہ شیر شاہ نے اس جگہ کو قلعے کی تعمیر کے لیے چنا، لیکن قلعے کی تعمیر کا حکم دینے کے بعد جب وہ واپس جنوبی ہندوستان کی طرف گیا تو پھر اُسے دوبارہ پنجاب کی طرف آنا نصیب نہ ہوا۔ چناں چہ اِس قلعے کی تعمیر کو اس کے جانشینوں نے پایہء تکمیل تک پہنچایا۔ قلعے کی تعمیر کا کام 1541ء میں شروع ہوا۔ یہ قلعہ ڈھلوان اور اُونچی نیچی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ کہیں بھی اِس کی فصیلوں کی بنیادیں نظر نہیں آتی اور یہ سطح زمین کے اُوپر بنا ہوا ہے۔ اِس کے شمال اور مغرب میں ایک برساتی نالہ بہتا ہے، جسے نالہ کاہان کہا جاتا ہے۔ مشرق میں ناقابلِ عبور گھنے جنگل پر مشتمل پہاڑیاں ہیں اور جنوب میں دُور تک سطح مرتفع ہے، جس کے سرے پر ٹلہ جوگیاں کا بلند و بالا پہاڑ بڑی شان سے سر اُٹھائے کھڑا ہے۔

قلعے کا محیط تقریباً دس کلومیٹر اور قطر تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر ہے۔ اس نام کا قلعہ ہندوستان کے صوبہ بہار میں بھی واقع ہے، جس کا نام روہتاس گڑھ ہے۔ یہ قلعہ شیر شاہ کو مضبوطی کے لحاظ سے بہت پسند تھا۔ چناں چہ قلعہ روہتاس کا نام اسی قلعہ کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔

1554ء میں ہمایوں ایران سے واپس آیا اور یہ قلعہ اُس کے قبضہ میں آگیا۔ مغل بادشاہوں کے زوال کے بعد افغانستان کے دُرانی حکمران اس پر قابض ہو گئے۔ سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کیا تو روہتاس اُن کی جاگیر میں شامل تھا۔ اس کے بعد یہ قلعہ انگریزوں کی عمل داری میں رہا۔

اس قلعے کی فصیل میں 68 برج اور 12 دروازے ہیں۔ فصیلوں کی چوڑائی نو میٹر سے بارہ میٹر ہے۔ اور بلندی دس میٹر سے اٹھارہ میٹر ہے۔ ساری فصیل زینوں کی مدد سے آپس

میں مربوط ہے۔ قلعے کے بارہ دروازے ہیں۔ تمام دروازے نہایت خوب صورت مضبوط اور شان دار بنائے گئے ہیں۔ اُس دور میں علاقے کے قبائل کی سرکشی کی وجہ سے قلعے کے لیے پتھروں کا مہیا ہونا نہایت دُشوار تھا چنانچہ فی پتھر ایک اشرفی کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔

دروازوں کے علاوہ قلعے کے اندر چند عمارتیں بھی تاریخی یادگاروں کے طور پر موجود ہیں۔ اِن میں سے سب سے اہم مان سنگھ کا محل ہے۔ اِس کا نام شہنشاہ اکبر کے ایک نورتن راجہ مان سنگھ کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ گنبد نما دو منزلہ عمارت ہے۔ اب صرف نچلی منزل میں ایک کمرہ موجود ہے اور اُوپر والی منزل میں ایک گول کمرہ ہے، جس میں مشرقی اور جنوبی سمت دو دو بالکونی بنائی گئی ہیں، جن سے شہر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ جنوبی بالکونی کے بالمقابل قلعے میں ایک پھانسی گھاٹ نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کے اس بالکونی سے پھانسی دینے کا منظر دیکھا جاتا ہو گا۔

اس کے علاوہ کابلی دروازے کے ساتھ ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ جسے شاہی مسجد کہا جاتا ہے۔ یہ بھی قلعے کی تعمیر کے ساتھ تعمیر کی گئی تھی۔ یہ ایک وسیع کمرے پر مشتمل ہے، جسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اِس مسجد میں داخل ہونے کے لیے تین محرابی دروازے ہیں۔ تینوں دروازوں کے اُوپر کونوں میں کلمہ طیبہ کندہ ہے، جس کے کناروں کو خوب صورت کنول کے پھولوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ سامنے کی دیوار پر 33 دائروں میں لفظ "اللہ" کندہ ہے۔ محرابوں کے دونوں کناروں کو سورج مکھی کے پھولوں کے نقوش سے سجایا گیا ہے۔ اِس مسجد میں باقاعدہ نماز کا انتظام نہیں ہے۔ مسجد میں نہ مئوذن، نہ امام اور نہ وضو کے لئے پانی کا انتظام ہے، مسجد میں سیر و تفریح کی غرض سے آنے والے لوگوں کے سوا کوئی اور نمازی نظر نہیں آتا۔

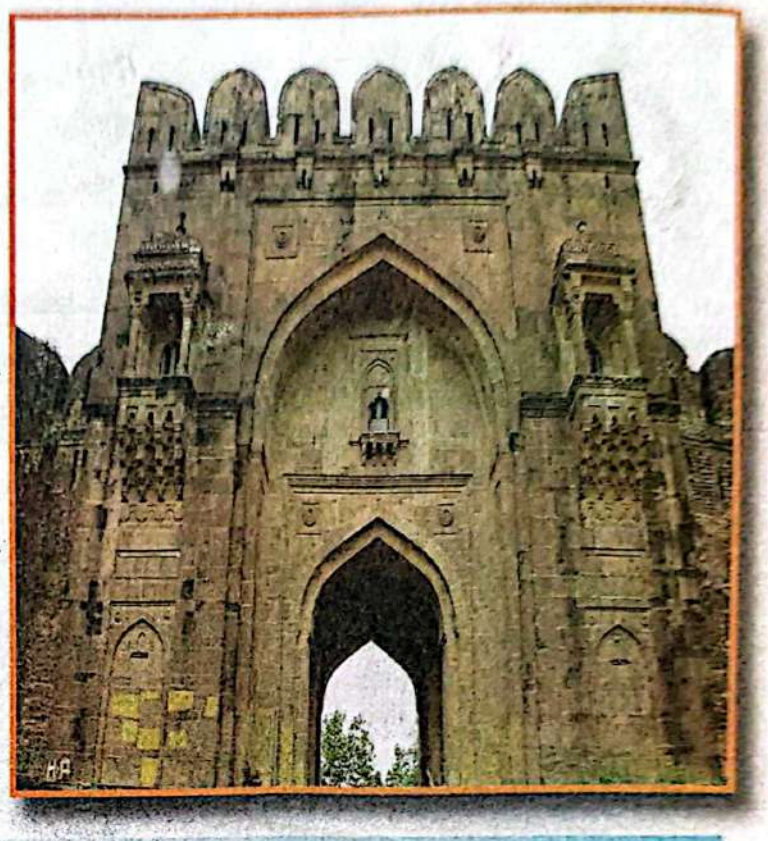

قلعہ کے اندر دو باؤلیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ جو یقیناً پانی کی ضروریات کو پوری کرتی ہوں گئیں۔ یہ چٹانی زمین کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ یہ باؤلیاں دراصل زینہ دار کنوئیں ہیں۔ ان میں سے ایک کابلی دروازے کے نزدیک ہے اور دُوسری موری دروازے کے سامنے اندر کی طرف ہے۔ کابلی دروازے والی باؤلی میں پانی کی سطح تک پہنچنے کے لیے 60 سیڑھیاں اُترنی پڑتی ہیں۔ جب کہ دُوسری باؤلی میں پانی کی سطح تک پہنچنے کے لیے 150 سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اب اس ٹوٹے پھوٹے قلعے کی مرمت کا آغاز کیا ہے۔

یہاں سیر کے لیے آنے والوں کو چاہیے کہ سیر کے لیے سردیوں کے موسم کا انتخاب کریں، کیوں کہ گرمیوں کے موسم میں یہاں شدید گرمی ہوتی ہے اور سایہ دار درخت اور پناہ گاہیں ناپید ہیں۔

میرے پسندیدہ اشعار

آپ کے پسندیدہ اشعار پر مبنی "تعلیم و تربیت" کا نیا دل چسپ سلسلہ

محمدؐ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو ایماں نا مکمل ہے
وارث علی، کراچی

میں تو جیتا ہوں فقط تیری محبت کے لیے
ورنہ مجھ کو اس جہاں سے کوئی دلچسپی نہیں
تاشف احمد، لاہور

زبان سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ جو مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
محمد نشیل سرور، سرگودھا

ہوئے نام ور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
شکیل اختر، فتح جنگ

زندگی بھر نہ پڑے تم پہ غموں کا سایہ
میرے ہونٹوں پہ دُعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
طارق محمود، فتح جنگ

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ
محمد ریحان صفدر، ڈیرہ غازی خان

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آسان نہیں مٹانا نام ونشان ہمارا
علی شہروز، فیصل آباد

اُڑا کے لے گئی پتے خزاں کی ہوا
شجر علامتِ ماتم دکھائی دیتا ہے
سید منہاس محمود، راول پنڈی

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز
ہارون الرشید، جہلم

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تُو
آہ! اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو
عاقب جاوید، کوہاٹ

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دُنیا نہ وہ دُنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی
فصیحہ اشرف، مرید کے

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں
وردہ طاہر، ساہی وال

مٹا ڈالو اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہیے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے
سمارہ نسیم، نندوال

نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تُو نہیں جہاں کے لیے
عاطف فراز، تلہ گنگ

میں نے جس شاخ کو پھولوں سے سجایا تھا فراز
میرے سینے میں اُسی شاخ کا کانٹا اترا
محمد شاہد خواج، واہ کینٹ

ہجومِ غم میری فطرت بدل نہیں سکتا
میں کیا کروں میری عادت ہے مسکرانے کی
انس احمد ضیاء، بھلوال

جاتی ہے اگر جان تو چلی جائے بلا سے
توہینِ رسالت کو گوارا نہ کریں گے
سلمٰی صفی، ٹمن

دُکھ بانٹنے کی چیز نہیں، پھر بھی دوستو
ایک دُوسرے کے حال سے واقف رہا کرو
شہباز خان، شبقدر

کوئی اِس دور میں وہ آئینے تقسیم کرے
جن میں باطن بھی نظر آتا ہو ظاہر کی طرح
تاج محمد، ڈیرہ غازی خان

مانگے کی روشنی سے نہ پاؤ گے راستہ
اس تیرگی میں لے کے خود اپنے کنول چلو
جواد احمد، کراچی

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
جویریہ ناز، جلال پور جٹاں

لبوں پہ اُس کے بد دُعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے، جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی
سید عبدالاحد، فیصل آباد

پہنچے ہیں کشتِ سحر تک اپنے لہو سے
ہم مانگے ہوئے سورج سے سویرا نہیں کرتے
اُم رومان، گوجرانوالا

ساحل پہ کتنے لوگ میرے ساتھ ساتھ تھے
طوفاں کی زد میں آیا تو تنکا نہیں ملا
اقراء کائنات، کراچی

تُو اے مسافر! خود چراغ بن اپنا
کر اپنی ہی ذات کو داغِ جگر سے نورانی
عامر خان، جھنگ

منزل کی جستجو میں کیوں بھٹک گیا ہے راہی
اتنا عظیم ہو جا کہ منزل تجھے خود پکارے
ثناء نیاز، حویلی لکھا

☆ایک چوہے کو جنگل میں ایک ہاتھی کا بچہ نظر آیا۔ چوہے نے اُسے بہت غور سے دیکھنے کے بعد پوچھا: ''آپ کی کتنی عمر ہے؟'' ہاتھی کے بچے نے کہا ''تین ماہ'' پھر ہاتھی کے بچے نے چوہے سے پوچھا: ''آپ کی عمر کتنی ہے؟'' چوہا شرمندگی سے بولا۔ ''عمر تو میری چھ ماہ ہے، لیکن میری صحت خراب رہتی ہے.....''

(حافظ عبدالرحمٰن، فیصل آباد)

☆ تین گپ باز آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔

پہلا بولا: ''میں اتنی گرم چائے پیتا ہوں کہ کیتلی سے پیالی میں نکالتے ہی پی لیتا ہوں۔''

دُوسرا: ''تم تو بہت ٹھنڈی کر کے چائے پیتے ہو، میں تو سیدھا کیتلی سے منہ لگا لیتا ہوں۔''

تیسرا بولا: ارے جاؤ، جاؤ تم دونوں ہی بہت ٹھنڈی چائے پیتے ہو، میں تو شکر، پتی اور دودھ ایک ساتھ منہ میں ڈال کر چولہے پر بیٹھ جاتا ہوں۔'' (حرا خالد، یزمان)

☆استاد: جو لوگ سن نہیں سکتے انہیں انگلش میں کیا کہتے ہیں؟

شاگرد: ''جو مرضی کہہ دیں، وہ کون سا سن سکتے ہیں۔''

(تسمینہ ارشد، ہڑھیال)

☆مریض (ڈاکٹر سے): ''ڈاکٹر صاحب! آپ نے مجھے جو طاقت کی دوا لکھ کر دی تھی، وہ تو میں بہت باقاعدگی سے کھا رہا ہوں، مگر پھر بھی میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔''

ڈاکٹر: ''ہو سکتا ہے، آپ کی خوراک ٹھیک نہ ہو۔ ویسے آج کل آپ کیا کھا رہے ہیں؟''

مریض: (حیرت سے) ''اچھا تو ان گولیوں کے ساتھ مجھے کھانا بھی کھانا تھا؟'' (دامن زہرا، اسلام آباد)

☆شاگرد: ''کیا کسی کو ایسے کام پر جو اُس نے نہ کیا ہو کوئی سزا مل سکتی ہے؟''

اُستاد: ''نہیں۔''

شاگرد: ''شکر ہے آج میں نے ہوم ورک نہیں کیا۔''

(گلاب نیاز خان، کوہاٹ)

☆ایک پاگل: (دُوسرے پاگل سے) ''جب ٹرین آتی ہے تو پھاٹک کیوں بند کرتے ہیں؟''

دُوسرا پاگل: ''تاکہ ٹرین شہر کی طرف نہ بھاگ جائے۔''

(محمد عمیر خالد، بورے والہ)

☆استاد (شاگرد سے): ''تم جغرافیہ یاد کر کے آئے ہو۔''

شاگرد: ''نہیں جناب۔''

استاد: (غصے سے) ''کیوں؟''

شاگرد: ''جناب! کل ایک جلسے میں ایک سیاسی رہنما کہہ رہے تھے کہ ہم جلد ہی دُنیا کا نقشہ بدل دیں گے۔'' (محمد اُسامہ نوید، راول پنڈی)

☆ایک دولت مند خاتون نے پارٹی سے واپس آ کر اپنی نئی ملازمہ سے پوچھا۔

''فریج صاف کیا ہے یا نہیں؟''

''جی ہاں بیگم صاحبہ! سب صاف کر دیا ہے، خاص طور پر آم اور انگور تو بہت مزے دار تھے۔'' (سارہ طارق، فیصل آباد)

☆ماسٹر صاحب: ''بچو! ہیڈ ماسٹر صاحب آنے والے ہیں۔ وہ تم سے کچھ سوال کریں گے کہ تم کو کس نے بنایا؟ (احمد سے مخاطب ہو کر) تم کہنا اللہ نے۔ (رشید سے) تم سے سوال کریں گے تم کون سی جماعت میں پڑھتے ہو، تم کہنا تیسری جماعت میں۔'' کچھ دیر میں ہیڈ ماسٹر صاحب آئے انہوں نے رشید سے پوچھا: ''تمہیں کس نے بنایا۔'' رشید نے کہا: ''جسے اللہ نے بنایا وہ پانی پینے گیا ہے، البتہ میں تیسری جماعت میں پڑھتا ہوں۔'' (فاطمہ ظفر، ہاجرہ ظفر، لاہور)

☆ایک انتہائی کنجوس شخص کے دانت میں درد ہوا تو وہ ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے دانت کا معائنہ کر کے کہا: ''جناب یہ دانت تو نکالنا پڑے گا۔'' کنجوس نے پوچھا: ''اس کی کتنی فیس ہو گی؟''

ڈاکٹر بولا: ''دو سو روپے۔''

کنجوس شخص نے اطمینان سے پچاس روپے ڈاکٹر کے ہاتھ پر رکھے اور بولا: ''آپ میرا دانت صرف ڈھیلا کر دیں، میں گھر جا کر خود اسے نکال لوں گا۔'' (صباحت فاطمہ، حویلی لکھا)

معصوم جذبوں کی معصوم کہانی ننھے منے دوستوں کے لئے

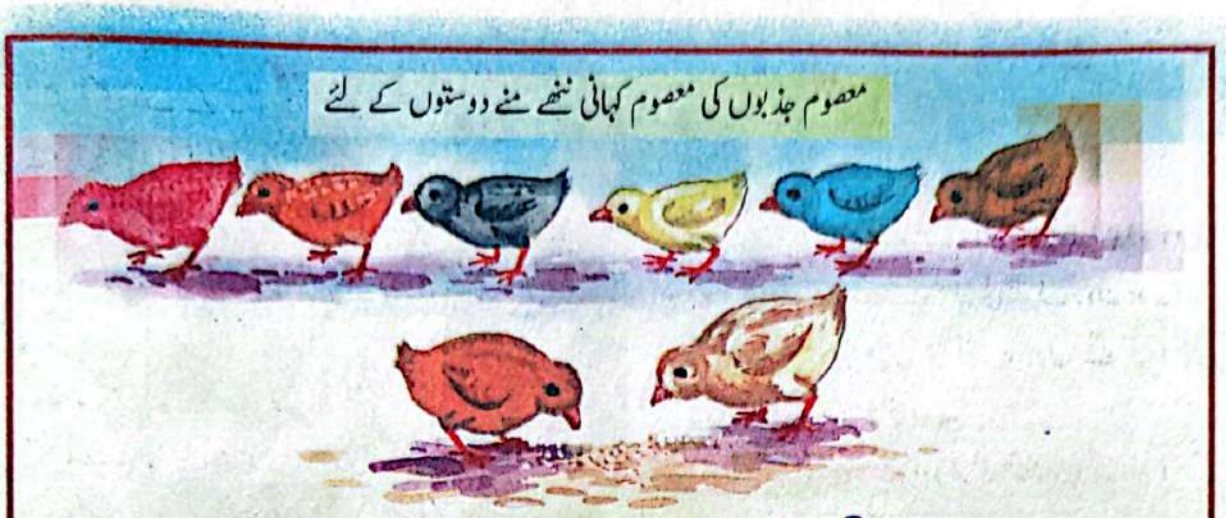

یہ تو میرے چوزے ہیں

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی (کراچی)

ننھے معصوم پیارے سے، بھولے بھالے محمد حسن نوید بڑی بے تابی سے دادا جانی کے بازار سے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ابھی حسن میاں تین سال کے تھے اور انھیں ماما اور بابا کی طرف سے کسی کے ساتھ مارکیٹ جانے کی اجازت نہ تھی۔

صبح ناشتے کے بعد ماما نے ایک لمبی سی پرچی ابا کو پکڑا دی اور ساتھ ہی چار ہزار روپے بھی دیے۔

"ابا جان! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آج ناشتے کے بعد بازار سے یہ ضروری سامان لا دیجیے۔ شام کو نوید کے کچھ دوست آئیں گے اور رات کا کھانا کھا کر جائیں گے۔ اگر آپ یہ سودا جلد لے آئیں گے تو بڑی مہربانی ہو گی۔ مجھے مرغ کے گوشت پر روسٹ کرنے کے لیے مسالا لگا کر رکھنا ہے اور بکرے کے گوشت کی یخنی بھی نکالنی ہے۔ حسن کو چوزے کی یخنی دے دوں گی کہ آج سردی کچھ زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔"

ماما ایک ہی سانس میں بے تکان بولتی گئیں۔ ابا نے اُبلا ہوا انڈا سیاہ مرچ اور نمک چھڑک کر کھایا اور پھر چائے پی کر کہا۔

"بیٹی! ہم تو اخبار پڑھیں گے، تم یہ سودا مجھ بڈھے سے منگوانے کی بجائے جوان و طاقت ور ڈرائیور بابو سے منگوالو۔"

بہو بیگم بولیں: "ابا جی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر اس نگوڑے بابو کو تو آپ جانتے ہی ہیں، اللہ مارا بازار جاتا ہے تو وہیں کا ہو رہتا ہے۔ برسوں کا سڑا ہوا سودا اٹھا لاتا ہے جیسے دُکان دار اُسی کے انتظار میں تو کچرا جمع کیے بیٹھے تھے۔ میرے اچھے ابا....."

"پُچ..... پُچ..... پُچ..... پُچ..... اچھا بیٹی دل چھوٹا نہ کرو، ہم لا دیتے ہیں تمہارا مطلوبہ سودا، ابھی جاتے ہیں بازار۔"

بہو بیگم کے التجائیہ انداز پر ابا نے پیار سے بہو بیٹیا کو پچکارا اور واسکٹ جھاڑتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

حسن میاں بہت دیر سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ "دادا ابو کا بازار جانا اور چوزا لے کر آنا، اب آئے گا مزہ، میں بھی ابا کے ساتھ جاؤں گا۔" یہ سوچ کر انہوں نے نعرہ مارا..... "ابا!"

ابا نے کوئی نوٹس نہ لیا۔

یہ دیکھ کر حسن میاں نے دائیں ٹانگ زور سے زمین پر ماری "ابا" !!!..... حسن میاں نے "سی" کر کے ٹانگ پکڑی اور دُوسری ٹانگ دروازے کے سامنے فرش پر ماری۔ "ابا..... ابا کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"میں بازار جارہا ہوں، ہم یوں گئے اور یوں آئے۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" حسن میاں بولے۔

"ارے میاں! تم کیا کرو گے جا کر، بازار میں، وہاں بے انتہا رش ہوتا ہے، ہم تمہیں شام کو پارک میں لے جائیں گے۔ جھولے جھلائیں گے اور ہاں تمہارے لیے بازار سے چوزہ بھی لے کر آئیں گے۔"

اب تو حسن میاں کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔

"ٹھیک ہے ابا! میرا چوزہ لے آئیں۔"

"ہاں میرے پوتے، ہم تمہارا چوزہ ضرور لائیں گے۔"

ابا سامان کی فہرست لے کر گھر سے نکل گئے۔ حسن میاں نے اپنے الف۔ بے۔ پے کے پلاسٹک بلاک نکالے اور بلاک جوڑ جوڑ کر حروف سے الفاظ بنانے لگے۔

ب+ا+ب+ا=بابا

ا+ب+ب+ا=ابا

ابا نے حسن میاں کو بتایا تھا کہ جن حروف پر تشدید (گنگھی) ہو، ان حروف کو دو مرتبہ لکھا کرو، جیسے ابا میں "ب" کو دو مرتبہ اور "امّاں" میں "م" کو دو مرتبہ۔

---☆☆---

خاصی دیر ہو چکی تھی اور ابا ابھی تک بازار سے نہیں آئے تھے۔ حسن میاں کو نیند آنے لگی تھی۔ ماما نے انہیں "فیڈر" بنا کر دیا تو میٹھا میٹھا دودھ پی کر تو ننھے حسن میاں کو نیند آنے لگی۔ وہ اپنا سونے والا گانا "آں ں آں ں آں ں ں....." گاتے گاتے سو گئے۔

تین بجے کے قریب ابا سامان سے لدے گھر آئے۔

"بازار میں تو آگ لگی ہے۔" پھر فوراً ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ آس پاس دیکھا اور بولے "آگ لگی ہے یعنی بہت زیادہ مہنگائی ہے۔" ماما ہنستے ہوئے بولیں۔

"ابا جان! آپ کے پوتے صاحب آپ کا انتظار کرتے کرتے سو چکے ہیں۔ شام کو دو تین گھنٹے بعد اُٹھیں گے۔ جب تک میں اُن کے لیے یخنی بنا لیتی ہوں۔ آپ پہلے نماز ادا کر لیجیے پھر میں آپ کو کھانا لا دیتی ہوں۔"

شام کو چھ بجے کے قریب حسن میاں اُٹھے اور آنکھیں ملتے ہوئے ابا کے پاس آئے۔

"ابا! میرا چوزہ..... میرا چوزہ کہاں ہے؟"

"ہاں بھئی، تم منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ ماما تمہارا چوزہ لا دیتی ہیں۔" ابا بولے اور نماز کے لیے مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔

ابھی وہ دو چار سیڑھیاں ہی اُترے ہوں گے کہ انہیں حسن میاں کی زوردار چیخ سنائی دی۔

"الٰہی خیر!" ابا لرز اٹھے اور الٹے قدموں گھر کی جانب پلٹے۔

اب تو اندر سے حسن میاں کے زور زور سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

حسن میاں کے رونے کی آواز لحہ لحہ بڑھتی جارہی تھی۔

ابا گھبرا کر گھر کے اندر داخل ہوئے تو منظر ہی عجیب تھا۔ ماما اپنے ہاتھوں میں "چوزے" کی یخنی کا پیالہ پکڑے کھڑی تھیں اور حسن میاں زار و قطار رو رہے تھے۔

"کیا ہوا چھوٹے میاں؟"

حسن میاں بدستور روتے ہوئے بولے: "میں چھوٹے میاں نہیں ہوں۔"

ابا مسکراتے ہوئے بولے: "چلو تو کیا ہوا، بڑے میاں تو ہو نا!"

"آں ں ں ں..... ں ں ں..... اُوں..... اُوں!"

حسن میاں برابر رو رہے تھے۔ ماما الگ شرمندہ شرمندہ سی چور بنی کھڑی تھیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ حسن میاں اس لیے رو رہے ہیں کہ انہوں نے تو اپنے پالنے کے لیے "زندہ چوزہ" منگوایا تھا اور یہاں تو ماما نے اُس کی یخنی بنا دی۔ اسی لیے ضد کی جارہی ہے کہ میرے چوزے کو پیالے میں سے نکال کر زندہ کر دیں۔ ہم تو پالیں گے اِسے۔" ابا نے اس وقت بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور صرف اتنا کہا۔

"حسن میاں! زندہ کرنا تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور مارنا بھی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ہم تمہیں چوزہ دلواتے ہیں پہلے تم یہ یخنی تو پی لو۔"

ننھے حسن میاں فوراً بہل گئے، اپنے گورے گورے نرم وملائم گالوں سے آنسو پونچھتے ہوئے حیرت سے جھٹکے دار سسکی بھری اور ابا سے پوچھا۔

"کیا آپ میرا زندہ چوزہ لا دیں گے ابا جانی؟"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں بھئی۔" اب تو حسن میاں نہال ہو گئے۔

کچھ دیر بعد حسن کے ابا جان دفتر سے واپس آگئے۔ انہوں نے چوزے کا قصہ سن کر حسن میاں کو سمجھایا کہ چوزہ اگر مر گیا تو بہت گناہ ہو گا۔"

"بابا..... یہ گناہ کیا ہوتا ہے؟" حسن نے پوچھا۔

بابا سر کھجانے لگے۔ ابا نے کہا۔

"اب بتائے گناہ کیا ہوتا ہے؟"

حسن میاں حیرت سے ابا اور کبھی بابا کو دیکھ رہے تھے۔ حیرت اُن کے معصوم چہرے سے عیاں تھی۔ اچانک انھیں یاد آیا کہ انہیں تو ابا کے ساتھ چوزہ لینے جانا ہے لہٰذا انہوں نے اچک کر ابا کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

"ابا..... ابا..... میرا چوزہ لینے چلیں!"

ابا مسکرائے: "پہلے یہ تو بتایئے کہ گناہ کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں پتا۔" حسن میاں نے ہار مان کر کہا۔

بیٹا! گناہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی گندہ کام کرنے سے اللہ تعالیٰ اس گندے بچے یا بڑے سے ناراض ہو جاتا ہے اور اُس کو سزا دیتا ہے۔"

"اللہ میاں سزا دیتے ہیں گندے بچے کو؟" حسن میاں کے لہجے میں خوف تھا۔

"جناب..... اب آپ کو پتا چلا۔"

"جی ہاں ابا، میں گناہ نہیں کروں گا بس اپنا چوزہ پالوں گا۔ ماما نے میرے چوزے سے میرے لیے سوپ بنا دیا۔ اَب آپ مجھے نیا چوزہ دلا دیں ابا۔"

ابا نے حسن میاں کے ماتھے پر پیار کیا۔ اپنے ہونہار پوتے کو بڑے فخر کے ساتھ دیکھا اور بولے۔

"چلو، مارکیٹ چلتے ہیں، ماما سے اجازت لے کر آؤ۔ بابا کے دوست آنے والے ہیں، ہم جلدی سے گھر واپس آجائیں گے۔"

خوشی حسن میاں کے معصوم چہرے پر خوب صورت رنگ بن کر چھا گئی تھی۔ ابا نے دل ہی دل میں دُعا کی یا اللہ میرے اس پوتے اور دُنیا کے ہر بچے اور بڑے کو ہمیشہ خوش رکھنا اور میرے اس خاندان کو بھی ہمیشہ خوشی اور ایمان کی دولت سے مالا مال کرنا۔ حسن میاں ماما سے اجازت لے کر اور اپنی اونی ٹوپی پہن کر واپس آچکے تھے۔

"ابا! چلیں، ماما نے کہا ہے کہ ابا سے کوئی ضد نہ کرنا، میں آپ سے کوئی ضد نہیں کروں گا۔"

ابا نے حسن میاں کو گود میں لینا چاہا تو وہ فوراً اپنی ننھی سے اُنگلی اٹھا کو بولے:

"ابا! میں پاؤں پاؤں جاوں گا کیونکہ اب میں تھری ائیرز (تین سال) کا ہو چکا ہوں۔"

دس منٹ بعد وہ گھر سے نزدیک واقع مون مارکیٹ میں آچکے تھے۔ حسن میاں بڑی بے تابی سے مرغی والے کی دُکان تلاش کر رہے تھے۔ ابا نے اُن کی پریشانی بھانپ لی اور مسکراتے ہوئے انھیں ایک کھلونوں کی دُکان میں لے آئے اور ایک الماری کے سامنے کھڑا کر دیا۔ الماری کے اندر نظر پڑتے ہی حسن میاں ہکا بکا رہ گئے کیونکہ الماری رنگ برنگے نرم وملائم چوزوں سے بھری پڑی تھی۔

"ابا..... یہ تو نقلی چوزے ہیں۔" بہت دیر بعد حسن میاں کے منہ سے حیرت بھری آواز نکلی۔

"جی ہاں بیٹا! زندہ چوزہ تو مر جاتا ہے نا، یہ والا چوزہ کبھی نہیں مرے گا۔ تم زندہ چوزے کو پالو گے اور اگر وہ بڑا بھی ہو گیا تو ماما اُس کا پلاؤ بنالیں گی، جب کہ یہ والا چوزہ تو ہمیشہ چوزہ ہی رہے گا۔"

ننھے حسن میاں کے ننھے سے دماغ میں جلد ہی یہ بات آگئی کہ واقعی یہ سودا فائدے والا ہے، چنانچہ فوراً ابا سے فرمائش کر دی۔

"ابا! پلیز دو تین چوزے دلا دیں، میں ان کو ہی پال لوں

گا۔ یہ بڑے بھی نہیں ہوں گے اور کاٹیں گے بھی نہیں۔"

ابا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"صرف دو تین، ہم تو آپ کو سات چوزے دلائیں گے اور سات الگ الگ رنگوں کے۔" اب تو حسن میاں خوشی سے جھوم اُٹھے۔ دُکان دار لڑکا بھی اس صورتِ حال سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ابا نے اس سے ہرا، لال، نیلا، پیلا، گلابی..... ہر رنگ کا ایک چوزہ پیک کرایا اور باہر آگئے۔ حسن میاں خوشی سے اچھلتے کودتے گھر کو روانہ ہو گئے۔

جب دادا پوتا گھر پہنچے تو بابا کے دوست کھانے پر آچکے تھے۔ پورے گھر میں مزے دار کھانوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

"حسن میاں! خوشبو سونگھ کر بتلاؤ کہ کیا کیا پکایا ہے تمہاری دادی اماں اور ماما نے آج؟"

حسن میاں نے خوب سوں سوں کیا اور پھر بولے۔

"ابا! اماں نے پلاؤ بنایا ہے، ماما نے کسٹرڈ، اماں نے کباب بھی بنائے ہیں اور دہی والا کیا ہوتا ہے ابا؟"

"رائتہ!"

"اور وہ رائتہ بھی بنایا ہے۔" ابھی ابا کوئی جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ ڈرائنگ روم سے بابا کی آواز آئی۔

"حسن..... حسن..... یہاں آؤ، جاوید انکل کو سلام کرو آکر!"

"ابا میں جاؤں؟" حسن میاں نے ابا سے پوچھا اور ابا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

-----☆☆-----

ابا اپنے بستر پر لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے کہ حسن میاں کی دادی جان کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں۔

"آپ یہاں لیٹے ہیں اُدھر کھانا لگ چکا ہے۔ آیئے کھانا کھا لیجئے۔ سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

سب لوگ کھانے کی میز کے گرد موجود تھے۔

"بھابھی صاحبہ..... آپ نے خاصا تکلف کر لیا۔" بابا کے دوستوں میں سے ایک بولا۔

ماما خاموش رہیں جبکہ اماں نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! مہمان تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتے ہیں اور اپنا رزق ساتھ لے کر آتے ہیں!"

اماں بابا کے سبھی دوستوں کو جانتی تھیں، کیونکہ یہ سب بابا کے بچپن کے دوست تھے۔ جاوید انکل مسکرانے لگے۔ اچانک ابا کی آواز اُبھری۔

"بھئی وہ حسن میاں کہاں ہیں؟"

اب تو سب کو احساس ہوا کہ حسن میاں منظر سے غائب ہیں۔ ماما فوراً اپنے کمرے کی طرف دوڑیں۔ ابھی وہ ذرا سا آگے بڑھی تھیں کہ حسن میاں ایک بڑا سا ڈبا ہاتھ میں لیے آتے نظر آئے۔ ابا تو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ وہ اپنے چوزوں کو لے کر آرہے ہیں۔ میز کے قریب آتے ہی حسن میاں نے سب کو سلام کیا۔ پھر ڈبا کھول کر ایک ایک کر کے تمام چوزے باہر نکالے اور کھانے کی میز پر رکھ دیے۔ اُن کی اس حرکت کو دیکھ کر بابا کے سارے دوست مسکرانے لگے۔ جاوید انکل مسکراتے ہوئے بولے۔

"منے میاں! یہاں تو بہت مزے مزے کے کھانے موجود ہیں، ہم آپ کے چوزے تو نہیں کھائیں گے۔"

حسن میاں نے ایک نظر انھیں، پھر ابا کو دیکھا اور بہت اعتماد کے ساتھ بولے۔

"نہیں انکل! یہ والے چوزے کھاتے نہیں ہیں۔ یہ تو میرے چوزے ہیں۔ ان کو صرف پالا جاتا ہے اور یہ مرتے بھی نہیں ہیں۔ جب یہ میرے ہاتھ سے نہیں مریں گے تو اللہ میاں بھی مجھ سے ناراض نہیں ہوں گے۔"

اتنا کہہ کر محمد حسن نوید صاحب اپنے ابا میاں کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گئے۔ کمرے میں مشترکہ قہقہہ بلند ہوا اور ابا نے حسن میاں کو مرغی کی ٹانگ پکڑا دی۔ حسن میاں نے بسم اللہ پوری پڑھی اور لالی پاپ کی طرح مرغی کی ٹانگ چوسنے لگے۔

بھیجا

ابا جان نے اسے بھیجا تھا "بھیجا" لینے کے لئے، وہ بھیجا لانے میں کام یاب ہوا یا نہیں، یہ تو کہانی پڑھ کر ہی معلوم ہوگا۔

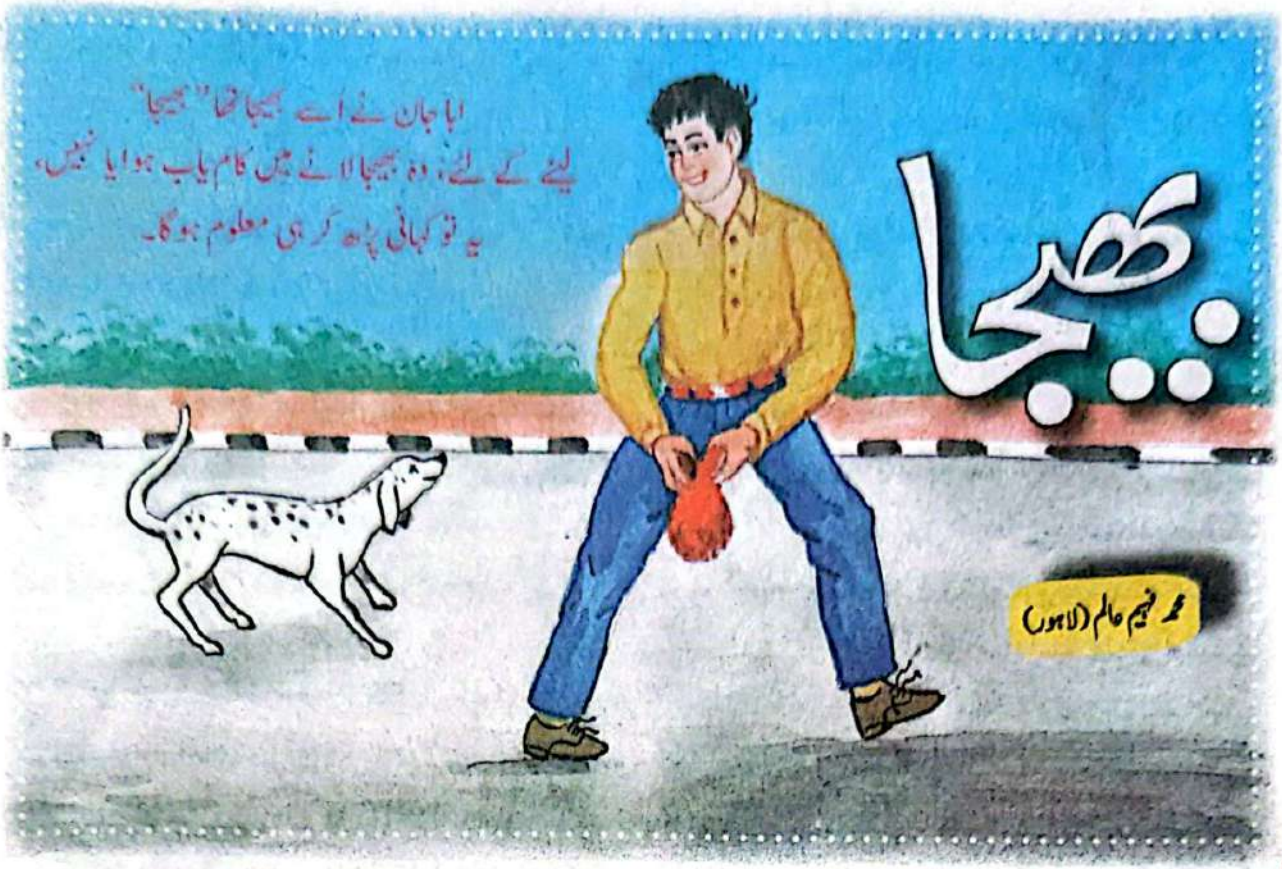

محمد نعیم عالم (لاہور)

"جناب شہزادہ جلیل الدین جلالی صاحب! آپ کو ابا جان یاد فرما رہے ہیں۔"

اسد میاں نے پہلے تو ہمیں جھک کر بادشاہوں کے درباریوں کی طرح سلام کیا اور پھر ہمیں مختلف القابات سے نوازتے ہوئے بولا۔

"تو کیا..... اِس سے پہلے ابا جان ہمیں بھولے ہوئے تھے۔"

ہم نے اپنی گول شیشوں والی عینک کے پیچھے سے انہیں گھورا۔

"بھلا آپ بھی کوئی بھولنے والی چیز ہیں۔" اسد میاں نے کہا۔ کیا ہم ابا جان کو اطلاع دے دیں کہ ولی عہد صاحب تشریف لا رہے ہیں؟"

"ابا جان کو اطلاع دے دی جائے کہ ہم تشریف لا رہے ہیں۔" ہم نے اسد کو گھورتے ہوئے کہا۔

اسد کو رخصت کر کے ہم سوچنے لگے کہ آخر ابا جان نے ہمیں کیوں طلب فرمایا ہے۔ پہلے تو ہم نے اپنے پورے ہفتے کے "اعمال نامہ" پر نظر دوڑائی، لیکن ہمیں اپنے اعمال نامہ میں کوئی خاص "گناہ" نظر نہ آیا، جس کی بناء پر ابا جان ہمیں طلب کرتے، سوائے اس کے کہ ساتھ والے لیاقت صاحب کی ٹنڈ پر دو کنکر اُس وقت مارے تھے جب وہ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے اپنی "ٹنڈ" کی مالش کر رہے تھے، ہفتے بھر میں ہم نے صرف دو بار "جگو" پھیری والے کی ریڑھی سے تین امرود چرائے تھے اور مائی نصرت کے مرغے کی ٹانگ اس وقت ہماری غلیل سے نکلے ہوئے پتھر کا شکار ہوئی تھی، جب ہم مرغ کو باندھ کر اُس کی ٹانگ پر نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ہمیں ایک خیال آیا اور ہم اچھل پڑے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے ہمارا قد چھوٹا ہے، ورنہ ہمارا سر چھت سے ٹکرا کر پھٹے ہوئے تربوز کا نظارہ پیش کر رہا ہوتا اور بے موسم کے اس تربوز کو شاید کوئی بھی کھانا پسند نہ کرتا۔

وہ خیال یہ تھا کہ چونکہ یہ ہفتہ ہم نے "شرافت" کے ساتھ گزارا ہے اور کوئی خاص شرارت بھی نہیں کی تھی اور اپنے اس وعدے کی پاسداری کی ہے، جو ہم نے ابا جان سے اُس وقت کیا تھا جب مائی شکیلہ کے گھر کی کھڑکی کا شیشہ ہمارے چھکے کی نذر ہونے کی وجہ سے ابا جان نے ہماری دھلائی

کی تھی اور ہم سے آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کا عہد لیا تھا، ہم نے بھی اس عہد کو نبھانے کی پوری کوشش کی تھی۔ پھر ہم اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے ابا جان کے کمرے کی طرف رواں دواں ہوئے۔ اُس وقت ابا جان اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔

"آؤ..... آؤ صاحب زادے..... آؤ۔" ہماری آہٹ سُن کر ابا جان نے اخبار سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

"آپ نے یاد فرمایا ہے۔"

"جی..... یہ ہم کیا سن رہے ہیں، کیا یہ سچ ہے؟"

ابا جان نے اخبار سے نظر ہٹائی اور ہمیں گھورتے ہوئے بولے۔

"جج.....جی..... کیا سن رہے ہیں آپ، ویسے آپ جو سنتے ہیں، سچ ہی سنتے ہیں۔" ہم ڈرتے ڈرتے بولے۔

پتہ نہیں انہوں نے ہمارے بارے میں کیا سنا تھا۔

"کیا!" ابا جان چلا اٹھے، مارے غصے کے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"بہت خوب تو پھر ہم نے ٹھیک ہی سنا تھا کہ صاحب زادے صاحب نافرمان ہوتے جا رہے ہیں، بازار سے سودا سلف لانے سے ان کی جان جاتی ہے۔ کوئی کتنا ہی کہے، لیکن مجال ہے جو صاحب زادے صاحب کے کان پر جوں تک رینگ جائے اور بازار سے کوئی چیز لا دیں، اب کیونکہ مجرم نے خود اقرارِ جرم کیا ہے۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے۔"

ابا جان غصے کے عالم بولتے چلے گئے۔ ان کے الفاظ سن کر ہمیں، اپنا سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا، پتہ نہیں انہوں نے ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کیا تھا۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے بعد گھر کا سودا سلف لانا تمہارے فرائض میں شامل ہو گا، جس سے روگردانی ناقابلِ معافی جرم ہو گا۔" ابا جان کا فیصلہ سن کر ہمیں اپنے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی، ہاتھوں کے طوطے، کبوتر، چڑیاں اور نہ جانے کیا کیا اڑتے نظر آئے۔

"لیکن ابا جان وہ۔" ہم نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں، ہمارا فیصلہ اب تبدیل نہیں ہو سکتا۔ ہمارا فیصلہ ابھی اور اسی وقت سے نافذ العمل ہو گا۔ یہ لو پیسے اور باورچی خانے سے تھیلا لو اور اسلم قصائی سے بکرے کا بھیجا لے آؤ، آج تو بھیجا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

ابا جان نے پیسے ہمیں تھمائے۔ پھر ہم نے ابا جان کے کمرے سے نکل کر باورچی خانے کا رُخ کیا، آپی اور اسد میاں کی ہنسی ہمیں بہت بُری لگ رہی تھی۔ ہم نے انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے تھیلا پکڑا اور بازار کی راہ لی۔

ہم اسلم قصائی کی دُکان پر پہنچے تو وہاں ہجوم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کوئی گوشت کا طلب گار تھا، کوئی قیمے کا، کسی کو گردن کی ضرورت تھی اور کوئی چانپ پر لٹو ہو رہا تھا۔ قصائی گوشت بنانے میں مصروف تھا۔ ہم بھی اس ہجوم میں گھس گئے، اور آخر کار قصائی تک جا ہی پہنچے۔

"جی..... وہ بھیجا ہے۔" ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ کیونکہ قصائی صاحب اپنے تلوار نما چھرے سے جس بے دردی سے گوشت کی درگت بنا رہے تھے، ہماری آنکھیں اُس کی تاب نہ لا سکتی تھیں۔

قصائی نے اپنا تلوار نما چھرا زور سے گوشت پر مارا، جس سے ایک زور دار آواز پیدا ہوئی۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کی طرح ہمارے آواز بھی اس زور دار آواز میں دب گئی۔

"جی..... وہ بھیجا ہے۔"

قصائی نے دوبارہ چھرا گوشت پر مارنے کے لیے اٹھایا ہی تھا کہ ہم نے اس مرتبہ ذرا زور سے کہا۔ قصائی صاحب نے بے رخی سے چھرا گوشت پر مارا اور ہماری طرف نظر کرم کیے بغیر پوچھا۔

"کس نے بھیجا ہے؟"

"جی..... وہ بھیجا نہیں، بلکہ بھیجا ہے۔" ہم بھیجا پر زور دیتے ہوئے بولے۔

"میں بھی تو یہی پوچھ رہا ہوں کہ کس نے بھیجا ہے؟" قصائی نے آنکھیں نکالیں۔

"وہ.....دراصل ہمیں بھیجا چاہیے، بکرے کا بھیجا۔"

ہم نے جلدی سے کہا۔

"ارے چھوٹے..... اس کو ایک بھیجا..... دے دو۔" بات قصائی کی سمجھ میں آگئی تھی۔

اب ہم سمجھے چھوٹا کوئی واقعی چھوٹا سا لڑکا ہو گا، مگر جب لمبی لمبی مونچھوں والے ایک پہلوان نما آدمی نے بھیجا ہماری آنکھوں کے سامنے لہرایا اور اپنی گرج دار آواز میں کہا۔

"یہ لو بھیجا۔" ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے آسمان پر بادل گرج رہے ہوں، ہم ایک دم گھبرا گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی کوئل جیسی آواز سے ہمارے بھیجے کو اڑاتا۔ ہم نے جلدی سے بھیجا اُس سے لے کر تھیلے میں ڈالا اور پیسے اُس کی طرف تقریباً اچھالتے ہوئے وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔

ابھی ہم بھیجا لے کر کچھ دُور ہی گئے تھے کہ اپنے پیچھے کسی کے آنے کا احساس ہوا۔ اب جو پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہمارے اوسان خطا ہو گئے، آنکھیں مارے خوف اور حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کیوں کہ ایک کتا بڑی ادا سے دُم ہلاتا، بھیجا سونگھتا اور رال ٹپکاتا ہمارے پیچھے چلا آرہا تھا۔ ویسے ہم اتنے بزدل بھی نہیں، لیکن کتے کا معاملہ ذرا دُوسرا ہے۔ کتے کو دیکھ کر ہماری گرفت تھیلے پر مضبوط ہو گئی۔

اب جو کتے نے ہمیں چوکنا ہوتے دیکھا تو اپنی رفتار تیز کر دی۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سر پر پیر رکھ کر بھاگے، اب ہم آگے آگے اور کتا ہمارے پیچھے پیچھے تھا۔ ہم کئی گلیوں سے گزرے، لیکن کتے کا ایک ہی کام تھا، اُس نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ ہم دوڑتے دوڑتے مین روڈ تک پہنچ گئے۔ ٹریفک کا اشارہ بند تھا۔ اس لئے ہم آسانی سے روڈ کراس کر گئے، لیکن جیسے ہی کتا روڈ کراس کرنے لگا اشارہ کھل گیا۔ اب ہمارے اور کتے کے درمیان گاڑیاں، بسیں اور موٹر سائیکلیں حائل ہو گئیں۔ ہم نے فاتحانہ انداز میں کتے کی طرف دیکھا، جو سڑک کی دُوسری طرف کھڑا بڑی حسرت سے ہمارے ہاتھ میں پکڑے تھیلے کو دیکھ رہا تھا۔ ہم نے تھیلا ہوا میں لہرایا اور ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ کتے کے ساتھ ریس لگاتے لگاتے ہم گھر سے کافی دُور نکل آئے تھے۔ اب لمبا چکر کاٹ کر ہمیں گھر پہنچنا تھا۔ جب ہم گلی میں چند قدم ہی چلے تھے کہ ٹھٹھک کر رہ گئے۔

گلی میں دو کتے شاید ہمارے ہی منتظر تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی بھونکنا شروع کر دیا۔ ابھی ہم ان سے پیچھا چھڑانے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ابا جان کی آواز سنائی دی۔

"ارے نامعقول میں نے تمہیں بھیجا لینے بھیجا تھا اور تُو یہاں مٹرگشت کرتا پھر رہا ہے۔"

پہلے تو ہم سمجھے شاید ہمارے کان بج رہے ہیں، لیکن جب ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا تو وہ ابا جان ہی تھے۔

"وہ..... وہ..... ابا جان ہم گھر کا راستہ بھول گئے تھے۔" دوڑ دوڑ کر ہمارا سانس پھولا ہوا تھا۔

"اچھا تو تم..... گھر کا راستہ بھول گئے تھے۔ تمہارے بھیجے میں بھوسا بھرا ہوا ہے جو تم اپنے گھر کا راستہ بھول گئے تھے۔"

"نن..... نہیں ابا جان..... وہ..... وہ۔" ہم نے کتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہا، لیکن کتے تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھے۔

"اچھا، اچھا..... اب زیادہ باتیں مت کرو، چلو میرے ساتھ گھر چلو۔"

اب ہم ابا جان کو کیسے بتاتے کہ بھوسا تو کیا، اس بھیجے نے تو ہمارے بھیجے میں پتا نہیں کیا کیا بھر دیا تھا۔

!!!☆!!!

ہنسنا منع ہے۔۔۔!

ابو: (منے سے) "تم رات کب تک پڑھتے رہے تھے؟"

منا: "رات بارہ بجے تک۔"

ابو: "لیکن رات گیارہ بجے تو لائٹ چلی گئی تھی۔"

منا: (معصومیت سے) "ابو جی! میں پڑھنے میں اس قدر مگن تھا کہ لائٹ جانے کا پتا ہی نہیں چلا۔" (انوش سبیعہ، اسلام آباد)

شکار ہوا دُشوار

محمد عارف عثمان (لاہور)

ساتھیو! آپ کا ساتھی پیٹر براؤن ایک نئی کہانی کے ساتھ حاضر ہے۔ اس بار ہم جس جنگل میں گئے اُس میں ہر قسم کے جانور تھے۔ اُس جنگل تک پہنچنے میں ہمیں آٹھ گھنٹوں کا سفر طے کرنا پڑا تھا۔ ہم راستے میں کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے رہے تھے، اس لیے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہم نے دن کا بیشتر حصہ سفر میں گزارا تھا۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ تیز دھوپ نے سردی کی شدت کم کر کے موسم کو بڑا خوش گوار بنا دیا تھا۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی جوزف اور سوزانے اپنے اپنے کیمروں سے جنگل کے مختلف مناظر ریکارڈ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جنگل کے آغاز میں ہمیں اِکا دُکا جنگلی جانور نظر آئے۔ ہرے بھرے درخت آنکھوں کو بھلے لگ رہے تھے۔ درختوں پر لگے سرخ سرخ انار، سیب اور آڑو دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ دُور فضا میں اُڑتی ہوئی بہت سی چڑیاں نظر آرہی تھیں۔ یہ چڑیاں عام چڑیوں کی نسبت کچھ بڑی دکھائی دیتی تھیں۔ چڑیوں کے بعد طوطوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ جنگل کے اُوپر اور نیلے نیلے آسمان کے نیچے یہ ایک خوب صورت منظر تھا۔ جوزف یہ منظر اپنے کیمرے میں محفوظ کر رہا تھا۔

"ارے یہ کیا؟" جوزف کی آواز پر میں نے گاڑی رُکی اور ہم سب نے چونک کر فضا میں دیکھا۔ طوطوں پر ایک باز نے حملہ کر دیا تھا۔ باز کے حملہ کرتے ہی طوطوں میں خوف وہراس پھیل گیا تھا۔ وہ جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے باز نے کئی طوطوں کو اپنے پنجوں میں دبوچا اور کچل مسل کر نیچے پھینک دیا۔ پھر اُس نے غوطہ لگایا اور ایک طوطے کو اپنے پنجوں میں لے کر ایک طرف اڑتا ہوا غائب ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں دُوسرے طوطے بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"سر! وہ دیکھیے۔" جوزف نے دائیں طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا۔ چند قدم دُور سیب کے ایک درخت پر چار پانچ بندر اچھل کود رہے تھے۔ ایک بندر ایک موٹی شاخ پر سو رہا تھا جب کہ دُوسرا بندر سیب کھانے میں مصروف تھا۔ سوزانے فوراً اپنا کیمرہ لے کر اُن بندروں کی طرف بڑھی۔ ہم بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

"میں آپ کو ایک تماشا دکھاتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے

مائیکل گاڑی کی طرف بھاگا۔ جب وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ڈوری کا سات آٹھ میٹر لمبا ٹکڑا تھا۔

"کیا کر رہے ہو تم؟" ریٹا نے پوچھا۔

"بس تم دیکھتی جاؤ۔" مائیکل نے بے نیازی سے کہا اور درخت پر چڑھنے لگا۔ بندروں کی اچھل کود ختم ہو چکی تھی اور وہ حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ مائیکل کو درخت پر چڑھتے دیکھ کر بندروں کی حیرت مزید بڑھ گئی تھی۔ اِسی دوران دو بندر اچھل کر دُوسرے درخت پر چلے گئے۔

"آخر تم کیا کرنے جا رہے ہو؟" جوزف نے کیمرے کا رخ اُس کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر تم شور کرو گے تو میں اپنا کام نہیں کر سکوں گا۔" مائیکل نے جوزف کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ خود مجھے بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ مائیکل کیا کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ سوئے ہوئے بندر کے قریب پہنچ گیا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو تب ہمیں کچھ کچھ سمجھ آگیا کہ مائیکل کیا کرنا چاہتا ہے۔

"سر! آپ ان بندروں پر نظر رکھیں، کہیں یہ مجھ پر حملہ نہ کر دیں۔" اُس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

مائیکل خاموشی اور احتیاط کے ساتھ سوئے ہوئے بندر کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے بڑی تیزی سے سوئے ہوئے بندر کی دُم اور شاخ کے ساتھ ڈوری باندھ کر گرہ لگا دی۔ جب وہ گرہ لگا رہا تھا تو سویا ہوا بندر جاگ گیا۔ وہ مائیکل کو اپنے قریب دیکھ کر گھبرا گیا۔ بوکھلاہٹ میں بندر چھلانگ لگانے کے لیے اچھلا اور دُم کے بل لٹک گیا۔ اب بندر درخت سے اُلٹا لٹکا بے بسی سے چیخنے چلانے میں مصروف تھا۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر ہم سب بے اختیار قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئے۔ جوزف اور سوزانے ہنستے ہوئے اس منظر کو ریکارڈ کر رہے تھے۔ مائیکل چند لمحوں تک اس الٹے لٹکے ہوئے بندر کو دیکھ کر قہقہے لگاتا رہا، پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ وہ بار بار بندروں کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ مائیکل کو خدشہ تھا کہ اپنے ساتھی کو مصیبت میں گرفتار دیکھ کر دُوسرے بندر اُس پر حملہ نہ کر دیں۔ اُس کا یہ خدشہ درست تھا، اس لیے میں خود بھی گن سنبھالے بندروں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"مائیکل! تم نے بندر کے ساتھ خوب مذاق کیا ہے۔" جوزف کیمرے کے پیچھے سے بولا۔ میں نے جوزف کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ اسی وقت ریٹا چیخ کر بولی۔

"مائیکل..... مائیکل! تمہارے اُوپر بندر آرہا ہے، بچو۔"

ریٹا کی آواز سن کر میں نے فوراً مائیکل کی طرف دیکھا تو اپنے سامنے کا منظر دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ ایک بندر نے مائیکل کا سر اپنے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا اور اُسے زخمی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مائیکل بھی بندر سے خود کو بچانے کے لیے بھرپور جدوجہد کر رہا تھا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔

"مائیکل! حوصلہ رکھو میں آرہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے بندر کو ڈرانے کے لیے ہوائی فائر کیا اور جلدی سے آگے بڑھا۔ میں دو قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ مائیکل اور بندر دونوں زمین پر آگرے۔ زمین پر گرتے ہی مائیکل بندر کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ غصے سے بھرا ہوا بندر ایک بار پھر مائیکل کی طرف بڑھا، لیکن میں نے اُس کو موقع نہیں دیا اور پھرتی کے ساتھ فٹ بال کی طرح زور دار کک لگا کر اُسے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ پھر میں مائیکل کی طرف متوجہ ہوا۔ درخت سے گرنے کی وجہ سے اُسے معمولی چوٹ آئی تھی کیونکہ وہ زیادہ بلندی سے نہیں گرا تھا، مگر بندر نے اس کے سر اور خاص طور پر چہرے کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ خون میں تر اُس کا چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ جوزف، سوزانے اور ریٹا بھی ہمارے پاس پہنچ گئے تھے۔

میں مائیکل کو سہارا دے کر اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ مجھے اپنے سر میں سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے سر پر ہاتھ رکھا تو میرے ہاتھ میں بھی سوئیاں چبھنے لگیں۔ میں نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ میرے ہاتھ پر شہد کی کئی مکھیاں بیٹھی تھیں۔ میں نے نظر اٹھائی تو مجھے ہر طرف کالی چادر سی تنی ہوئی دکھائی دی۔ شہد کی ہزاروں مکھیاں ہمارے سروں پر منڈلا رہی تھیں۔ یہ مکھیاں بڑی تیزی سے نیچے آرہی تھیں۔ ریٹا،

سوزانے اور جوزف بھی ان مکھیوں کی زد میں آچکے تھے۔ ریٹا اور سوزانے نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس ناگہانی آفت پر کچھ دیر کے لیے میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ گن سے ہزاروں مکھیوں کا مقابلہ کرنا ناممکن سی بات تھی۔

"اُف مرے خدایا۔" میری زبان سے نکلا۔ میں نے اپنی ہمت جمع کی تاکہ اس مصیبت سے نجات کے لیے جدوجہد کر سکوں۔ اپنے ساتھ ساتھ میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی بچانا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر مائیکل کی تھی۔

شام ہو رہی تھی۔ رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے ہمارا گاڑی میں یا کسی ایک جگہ پر اکٹھا موجود ہونا ضروری تھا، ورنہ ہمارے لیے خطرات بڑھ سکتے تھے۔

"شاباش..... گھبراؤ مت..... جلدی سے گاڑی میں پہنچو۔" میں نے پکار کر کہا اور مائیکل کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میری آواز سن کر ریٹا، سوزانے اور جوزف اپنے سروں اور چہروں کو چھپاتے ہوئے اندھا دھند گاڑی کی طرف بھاگے۔ میں نے مائیکل کو سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش، مگر سر سے پاؤں تک درد کی ناقابلِ برداشت ٹیسوں نے مجھے لاچار کر کے رکھ دیا۔ میرا سر بھاری ہونے لگا تھا۔ دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میں بار بار سر کو جھٹک رہا تھا، لیکن درد اور غنودگی دونوں کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز لگاتار میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"سر! آپ خود کو بچائیں میں گاڑی میں پہنچتا ہوں۔" مکھیوں سے بچنے کے لیے مائیکل نے خود کو زمین پر بکھرے ہوئے پتوں میں چھپا رکھا تھا۔

مائیکل کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی۔ میں اُسے کسی بھی قیمت پر تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میری اپنی حالت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔ میرا دل ایک عجیب سے بوجھل پن اور اضطراب کا شکار تھا۔ درد کی لہریں میرے وجود میں طوفان برپا کر رہی تھیں، سر چکرا رہا تھا اور غنودگی نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں بدل رہی تھی۔ بڑھتی ہوئی سردی الگ اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ آخر کار مکھیوں کی یلغار نے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے مائیکل کو اکیلا چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے سوچا گاڑی یہاں سے چند قدم دُور ہے۔ مائیکل کے لیے گاڑی تک پہنچنا زیادہ دُشوار نہیں ہو گا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے سر کو جھکایا، چہرے کو بازوؤں میں

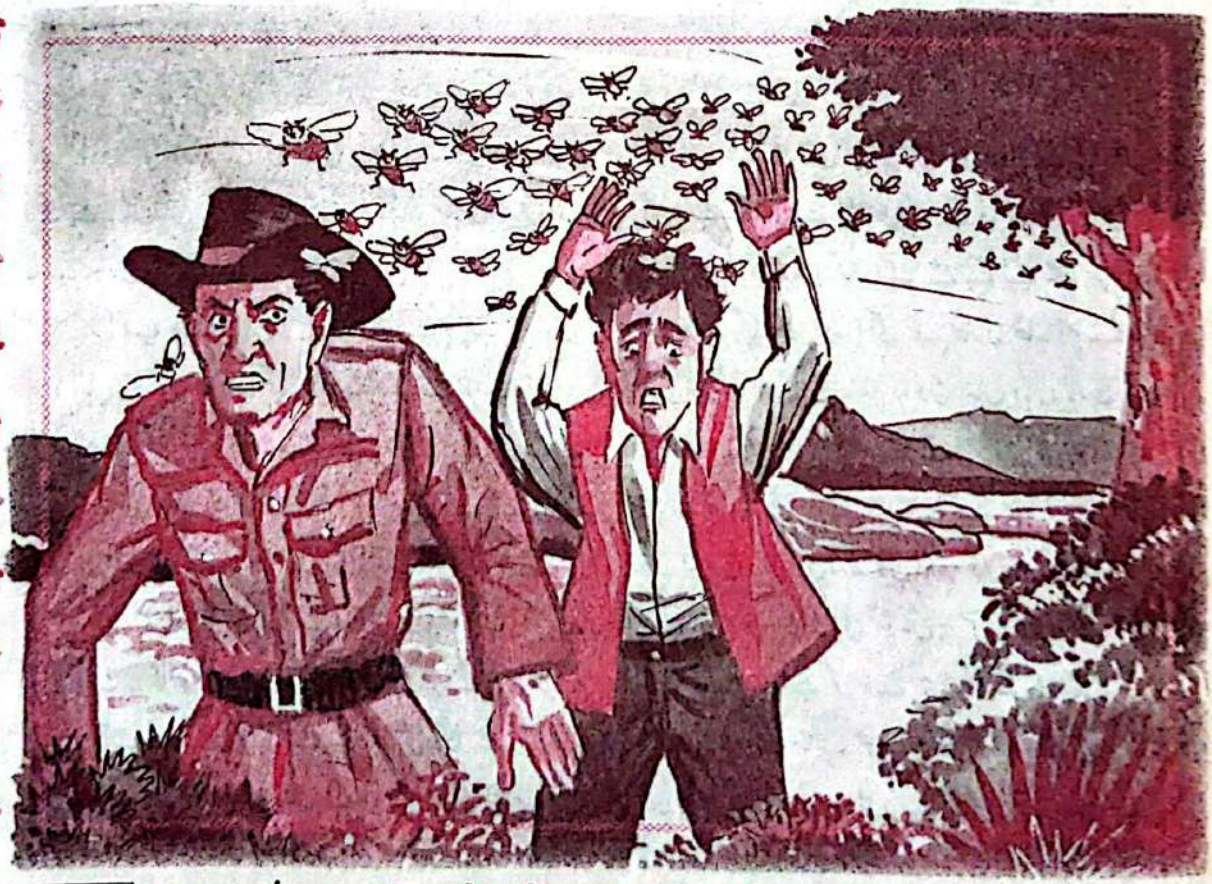

چھپایا اور گاڑی کی طرف دوڑ پڑا۔ شہد کی مکھیاں بھی میرے ساتھ ہی لپکی چلی آرہی تھیں۔ اُن کے کاٹنے سے میرا چہرہ سوج چکا تھا۔ گاڑی میں ہر قسم کی فرسٹ ایڈ کا انتظام موجود تھا۔ ہم سب فرسٹ ایڈ کے طریق کار سے بخوبی واقف تھے۔ اب دیر صرف گاڑی تک پہنچنے کی تھی۔ کافی دُور دوڑنے کے بعد میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا۔ گاڑی کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ غلطی میری تھی۔ میں غلط سمت میں دوڑتا جا رہا تھا۔ میں واپس ہوا اور ایک بار پھر گاڑی کی طرف دوڑنے لگا۔ میرا سر اتنا بھاری ہو چکا تھا کہ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے کئی من وزن اٹھا رکھا ہو۔ میرا سانس پھول گیا اور ٹانگوں نے دوڑنے سے انکار کر دیا۔ میرا وجود جیسے بے جان سا ہو گیا۔ ہوش وحواس بحال رکھنے کی سر توڑ کوشش کے باوجود مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور میں بے سدھ ہو کر گر پڑا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو گاڑی میں پایا۔ میرے سامنے مائیکل بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ میں بھی مسکرادیا۔ اُس کے چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ مائیکل کو دیکھتے ہی رفتہ رفتہ مجھے سب کچھ یاد آنے لگا تھا۔ اُسے بہتر حالت میں دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان محسوس ہوا تھا۔ میری نظر گاڑی میں لگی گھڑی پر پڑی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں پانچ چھ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ شہد کی مکھیاں اب غائب ہو چکی تھیں۔

"سر! آپ ٹھیک ہیں؟" مائیکل نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں..... کافی حد تک ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"جوزف اور ریٹا، سوزانے کو تلاش کرنے گئے ہیں۔ جب میں گاڑی میں پہنچا تھا تو جوزف اور ریٹا یہاں پہلے سے موجود تھے۔ سوزانے اُن کے ساتھ نہیں تھی۔ آپ بھی نہیں تھے۔ کئی بار کوشش کے بعد بھی جب آپ دونوں کے موبائل فونز سے کوئی جواب نہ ملا تو ہم آپ دونوں کو تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ آپ تو جلد ہی گاڑی سے کچھ دُور مل گئے تھے۔ ہم نے آپ کو آپ کے موبائل کی بیل کے ذریعے تلاش کیا تھا۔ میں آپ کے موبائل پر مسلسل فون کر رہا تھا اور جوزف سوزانے کے موبائل پر، آپ کا پتہ چل گیا، مگر سوزانے کا کچھ پتہ نہیں چل رہا، جوزف اور ریٹا دوبارہ سوزانے کی تلاش میں چلے گئے ہیں۔ میں بار بار سوزانے کے موبائل پر فون کر رہا ہوں، مگر وہ اٹینڈ نہیں کر رہی۔ ممکن ہے کہیں بے ہوش پڑی ہو۔" مائیکل نے تفصیل بتائی۔

"مائیکل! تم جوزف سے میری بات کراؤ۔ ہمیں سوزانے کو جلد از جلد تلاش کرنا ہو گا۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔ ایسا نہ ہو وہ جنگلی درندوں کی خوراک بن جائے۔" میں نے کہا۔

"جوزف! سوزانے کا کچھ پتہ چلا؟" جونہی اُس نے ہیلو کہا، میں نے فوراً پوچھا۔

"سر! شکر ہے آپ ٹھیک ہیں، ہم سوزانے کو تلاش کر رہے ہیں مگر ابھی تک اُس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔" جوزف نے جواب دیا۔

"تم لوگ کہاں ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"سر! جس جگہ شہد کی مکھیوں نے حملہ کیا تھا، ہم اُس جگہ سے پندرہ بیس گز دُور مغرب کی طرف ہیں۔" جوزف بولا۔

"ٹھیک ہے، احتیاط سے رہو، ہم بھی تمہارے پاس آرہے ہیں۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد میں اور مائیکل بھی سوزانے کی تلاش میں چل دیے۔ گاڑی سے نکلتے ہی کڑاکے کی سردی اور یخ بستہ ہوا نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ایک لمحے کے لیے میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ میرا سر ابھی تک بھاری تھا۔ ہم نے اپنی اپنی ٹارچ روشن کر لی تھی۔ ہم دونوں یہاں وہاں ٹارچ کی روشنی میں سوزانے کو تلاش کر رہے تھے، مگر اُس کا کچھ اتہ پتہ نہیں مل رہا تھا۔ مائیکل مسلسل سوزانے کے موبائل پر فون کر رہا تھا۔ بیل بج رہی تھی، مگر فون اٹینڈ نہیں ہو رہا تھا۔ جوں جوں رات گزر رہی تھی میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ جنگل کے زیادہ تر جانور رات کو سوتے ہیں مگر میں جانتا تھا کہ بعض درندے اور کچھ سانپ صرف رات کو ہی نکلتے ہیں۔ اس لیے میں سوزانے کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ رات کے سناٹے

میں تیز ہوا کی سیٹی جیسی آواز بہت پُر اسرار لگ رہی تھی۔ کہیں کوئی بندر چیختا، کوئی ہاتھی چنگھاڑتا یا کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا تو خوف میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔

"سر! رکیے، آپ کی دائیں طرف سانپ ہے۔"

مائیکل نے مجھے متوجہ کیا۔ میں نے دیکھا میری دائیں طرف تین چار فٹ آگے کالے رنگ کا ایک سانپ جا رہا تھا۔ ہم رک گئے۔ کچھ آگے جا کر سانپ گھاس میں گھس گیا۔ ہم پھر چل پڑے۔ مائیکل نے جوزف کا نمبر ملایا اور پوچھا کہ سوزانے کا کچھ پتہ چلایا نہیں؟ حسبِ سابق مائیکل کا بجھا ہوا چہرہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ جوزف کا جواب نفی میں تھا۔ جلد ہی ہم جوزف اور ریٹا کے پاس پہنچ گئے۔ وہ دونوں سردی کی بدولت سمٹے سکڑے ہمارے منتظر کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اُن کے چہروں پر کچھ رونق آگئی تھی۔

"میرے خیال میں اب ہمیں دُوسری طرف بھی دیکھنا چاہیے۔" میں نے کہا اور ہم چاروں اُس طرف چل پڑے جس طرف سوزانے نے شہد کی مکھیوں سے بچنے کے لیے بھاگی تھی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ افسردگی کے عالم میں کبھی مائیکل، کبھی جوزف اور کبھی ریٹا مسلسل سوزانے کے موبائل پر فون کر رہے تھے۔

"سوزانے بیچاری نہ جانے کس حال میں ہو گی۔" ریٹا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جوزف نے چیخ کر کہا۔

"خاموش ہو جاؤ، خاموش ہو جاؤ۔" ہم سب حیرت سے اُسے دیکھنے لگے۔

"سر! کچھ سنائی دے رہا ہے آپ کو؟" جوزف کی بات سن کر سب خاموش ہو گئے۔

"ارے..... یہ تو سوزانے کے موبائل کی آواز ہے۔" مائیکل نے کہا۔

"بالکل..... بالکل..... یہ سوزانے کے موبائل ہی کی بیل ہے۔" ریٹا خوشی سے چہک اٹھی۔

"اِس کا مطلب ہے کہ سوزانے یہیں کہیں موجود ہے۔" میں نے کہا۔

ہم سب خوش ہو گئے اور سوزانے کی تلاش میں لگ گئے۔ میں دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ سوزانے خیریت سے ہو۔ جوزف مسلسل سوزانے کے موبائل پر فون کر رہا تھا۔ سوزانے کے موبائل کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس آواز کا تعاقب کرتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری ٹارچوں کی روشنی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم درختوں کے ایک جھنڈ میں سوزانے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے فوراً اُس کی نبض چیک کی۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اُس کا چہرہ اور بازو سوج رہے تھے۔ اُس کے سر پر گہری چوٹ کا نشان تھا، جہاں خون جم چکا تھا۔ شاید بھاگتے ہوئے وہ کسی درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ خدا کا شکر تھا کہ کسی درندے نے اُسے نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ پھر ہم کافی مشکل سے گاڑی تک پہنچے۔ گاڑی میں پہنچتے ہی ریٹا نے اُسے انجکشن لگایا اور اُس کے منہ میں پانی ٹپکایا۔ ریٹا کی مسلسل کوششوں کی بدولت آدھے گھنٹے کے بعد سوزانے ہوش میں آگئی۔ ہم سب اُسے دیکھ کر مسکرائے۔ جواباً وہ بھی مسکرا دی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم واپس روانہ ہو گئے۔

"میں حیران ہوں کہ شہد کی مکھیاں کہاں سے نازل ہو گئی تھیں۔" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"میں بتاؤں سر!" ریٹا بولی۔

"ہاں ہاں..... کیوں نہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ نے بندر کو ڈرانے کے لیے جو ہوائی فائر کیا تھا وہ گولی ایک درخت پر موجود مکھیوں کے چھتے میں جا لگی تھی اور اُسی کے نتیجے میں مکھیوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔" ریٹا نے بتایا۔

"شہد کی مکھیوں نے ہم پر گولی لگنے کے باعث حملہ کیا تھا، یہاں تک تو بات درست ہے، مگر میرا خیال ہے کہ ہم پر جو مصیبت آئی ہے وہ اُس بندر کو تنگ کرنے کا نتیجہ ہے، جس کی دُم کو میں نے دوڑی سے باندھا تھا، ہم سب بندر کی تکلیف پر مسکرائے تھے، جانوروں کو تنگ کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔" مائیکل کی بات سن کر سبھی خاموش تھے کیونکہ اُس کی بات میں وزن تھا۔

---☆☆---

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

میں تعلیم وتربیت بچپن میں خود پڑھتا تھا، اب اپنے بچوں کو لا کر دیتا ہوں۔ جس طرح آپ لوگ بچوں کی تفریحی اور تعلیمی ضروریات پوری کر رہے ہیں وہ لائقِ تحسین ہے۔

(جاوید بسام، کراچی)

جنوری کا شمارہ بہت خوب صورت اور دل چسپ تھا۔ سب سے زیادہ مزے دار کہانی "سراغ مل گیا" تھی۔

(اسامہ طارق، ماریہ طارق، راول پنڈی)

جنوری کا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بوجھ اور دُوسرا سورج کہانیاں بہت پسند آئیں۔ ہمیں فروری کے رسالے کا انتظار رہے گا۔ (عاصم جاوید، لاہور)

جنوری کا شمارہ زبردست رہا۔ کہانیوں میں ٹیوشن آپی، رحمت پور کا الٰہ دین بہترین تھیں۔ (میمونہ ساجد، راول پنڈی)

مفید مشغلے بہت اچھا سلسلہ ہے، اِسے جاری رکھیئے گا۔ سلسلہ "آپ بھی لکھئے" میں شائع کی جانے والی تصویریں اس سلسلے کو مزید دلچسپ بنا دیتی ہیں۔ اس مرتبہ تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ "یہ ہے اسلام آباد" ایک معلوماتی تحریر تھی۔ پاکستان کے دُوسرے شہروں کے بارے میں بھی ایسی ہی تحاریر شائع کریں۔

(محمد مبین احمد، ساہی وال)

تعلیم وتربیت وطنِ عزیز کے ننھالوں کی جو تربیت کر رہا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ (محمد خرم خالد، کراچی)

تعلیم وتربیت کا جنوری کا شمارہ عمدہ تھا، خاص طور پر کہانیاں "اباجی" "بوجھ" اور "مضبوط رسی" اے ون تھیں۔

(محمد طاہر وسیم، جلال پور جٹاں)

کہانیوں میں مضبوط رسی، اونٹ رے اونٹ اور چیتا بہت پسند آئیں۔ (محمد اکبر جاوید، ڈیرہ غازی خان)

جنوری کا شمارہ بہت خوب صورت تھا۔ سرورق پر 2010ء کا ہندسہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کہانی "سراغ مل گیا" بہت پسند آئی۔

(عیشہ الراضیہ طارق، فیصل آباد)

جنوری 2010ء کا شمارہ ملا، جسے پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانیوں میں سب سے عمدہ کہانیاں ڈائری لکھنا، اباجی، سراغ مل گیا، رحمت پور کا الٰہ دین، دُوسرا سورج اور چیتا تھیں۔

(محمد سعید الحسن، سکھیکی منڈی)

جنوری کا شمارہ بہت زبردست تھا، کہانیوں میں مضبوط رسی، تتلی پیاری تتلی، رحمت پور کا الٰہ دین اور ابا جی بہت پسند آئیں۔ انکل! خاص نمبر کب شائع ہو گا؟ (محمد ضیاء اللہ، میاں والی)

☆ ان شاء اللہ گرمی کی چھٹیوں میں خاص نمبر شائع ہو گا۔

ہیلو انکل! اُمید ہے کہ آپ اپنی محفل کے کسی کونے میں مجھے بھی جگہ دیں گے اور میرے خط کو ردی کی ٹوکری سے دس نہیں بلکہ بیس فٹ دُور رکھیں گے۔ اس دفعہ سرورق شان دار تھا۔ کہانیوں میں خاص طور پر "اباجی" اور "ٹیوشن آپی" اچھی تھیں۔

(مشاء محمود، گوجرانوالا)

☆ لیجئے، ہم نے آپ کا خط ردی کی ٹوکری کی خوراک بننے سے بچالیا ہے۔

میں تعلیم وتربیت بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ ہر مہینے کے آخر میں اِس کا بہت انتظار رہتا ہے۔ جنوری کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ قلمی دوستی کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔

(محمد فیضان اشرف، فیصل آباد)

جنوری کا شمارہ بہت پسند آیا۔ خاص طور سے کہانیاں رحمت پور کا الٰہ دین، دُوسرا سورج اور سراغ مل گیا عمدہ تھیں۔

(راحت اسلم، گوجرانوالا)

جنوری کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ میں پہلے ہی ڈائری لکھنے کا عزم کر چکا تھا اور مفید مشغلے میں مفید مشغلہ ڈائری لکھنا پڑھتے ہی میرا عزم اور پختہ ہو گیا۔ (احمد سلمان ملک، گکھڑ منڈی)

انکل! تعلیم وتربیت میں کوئی سلسلہ وار ناول شروع کریں۔

(ثوبیہ یونس، کھڈیاں)

☆ ان شاء اللہ جلد کوئی ناول شروع کیا جائے گا۔

میں بی ایس سی کی طالبہ ہوں اور ہم سب بہن بھائیوں نے نصاب کی کتابوں کے بعد جو بھی سیکھا ہے وہ صرف تعلیم وتربت سے سیکھا ہے۔ (صبیحہ حفیظ، حافظ آباد)

تعلیم وتربیت کے تمام سلسلے بہترین ہیں۔ بلاعنوان، آپ بھی لکھئے معلوماتِ عامہ اور دماغ لڑاؤ جیسے سلسلے قارئین کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں۔ بلاشبہ تعلیم وتربیت ایک بہترین رسالہ ہے۔ جو قارئین کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ کچھ لکھنے پر بھی اکساتا ہے۔

(وجیہہ اقبال، کراچی)

جنوری کا شمارہ تمام رنگینیوں کے ساتھ 29 دسمبر کو ہی مل گیا تھا۔ سرورق پر ہندسہ 2010ء جلی حروف میں جگ مگا رہا تھا اور رنگ برنگے غبارے "ہیپی نیو ائیر" کے نغمے گا رہے تھے۔ کہانیوں میں بوجھ، دُوسرا سورج اور اباجی شان دار تھیں۔ "سراغ مل گیا" میں رمشاء کا دوبارہ آنا بہت اچھا لگا۔ (محمد آصف ریاض، جھنگ)

ہمیں جنوری کا رسالہ بہت پسند آیا۔ محمد فاروق دانش کی کہانی ٹیوشن آپی بہت اچھی تھی۔ (عدیل اصغر، اقصیٰ اصغر بہاول پور)

کسی بھی رسالے میں یہ میری پہلی تحریر ہے۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو مزید لکھوں گا۔ اُمید ہے آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ (اسعد رضا، فیصل آباد)

☆ تحریر اچھی ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

جنوری کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کہانی "اباجی" سپرہٹ تھی۔

(حاشر احمد، کراچی)

اِس بار بھی رسالہ عمدہ تھا، خاص طور پر نیا سلسلہ "مفید مشغلے" بہت زبردست ہے۔ (محمد اویس مصطفوی، اسلام آباد)

مجھے کہانیوں میں میرا نام ہے دودھ، دُوسرا سورج، مضبوط رسی، ٹیوشن آپی اور خزانہ بہت پسند آئیں۔ سرورق بہت اچھا تھا۔

(محمد ریحان صفدر، ڈیرا غازی خان)

جنوری کا شمارہ 25 دسمبر ہی کو مل گیا تھا۔ کہانیوں میں رحمت پور کا الٰہ دین (حسن ذکی کاظمی) اباجی! (نذیر انبالوی) بہت بہترین کہانیاں تھیں۔ افق دہلوی کی نظم "کبھی تم بھلاؤ نہیں" بھی عمدہ تھی۔ (محمد اسد الرحمٰن انور، لاہور)

کیا ہم ایک لفافے میں "آپ بھی لکھئے" کی ایک سے زیادہ تحریریں بھیج سکتے ہیں؟ (نازیہ نذیر، قصور)

☆ بھیج سکتے ہیں۔

میں آپ کو پچھلے دو مہینوں سے خط نہیں لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں تقریری مقابلوں میں مصروف تھا، مقابلوں میں میری ضلع میں دُوسری پوزیشن آئی ہے۔ (ذیشان احمد صدیقی، کندیاں)

☆ ہماری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔

جنوری کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کہانی "سراغ مل گیا" بہترین تھی۔ اس طرح کی اور کہانیاں بھی ہر شمارے میں شائع کیا کریں۔
(سردار خان، فیصل آباد)

جنوری کا شمارہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ بوجھ، دُوسرا سورج، رحمت پور کا الٰہ دین اور خزانہ کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ صائمہ کامران کی جاسوسی کہانی شامل کر کے آپ نے میری دل تمنا پوری کر دی۔ (کنول اشرف، گوجرانوالا)

جنوری کا رسالہ زبردست تھا۔ کہانیوں میں "تتلی پیاری تتلی" "مضبوط رسی" بہت اچھی تھیں۔ "سراغ مل گیا" تجسس سے بھرپور کہانی تھی۔ ہم سب بہن بھائی بڑے شوق سے رسالہ پڑھتے ہیں۔ ہم کچھ تحریریں بھیج رہے ہیں مہربانی کر کے ان کو رسالے میں جگہ دے دیں۔ (تاج محمد، ڈیرہ غازی خان)

آپ نے اوجھل خاکے کا سلسلہ بند کر کے اچھا نہیں کیا۔
(حسن احمد، راول پنڈی)

☆ ہم بہت جلد یہ سلسلہ دوبارہ شروع کر رہے ہیں۔

اے میرے پیارے تعلیم وتربیت! میرے خط کے لئے تھوڑی سی جگہ رکھنا۔ (معاذ احمد صدیقی، میاں والی)

☆ لیجئے، آپ کی دُعا قبول ہو گئی ہے۔

آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ قلمی دوستی کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ (محمد تنویر انگرا، پیلووینس)

کہانیوں میں ابا جی! اور سراغ مل گیا اچھی تھیں۔ تخلیق کار بننے کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ (ملک ہاشم ضیاء، گجرات)

میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تعلیم وتربیت کو اتنی ترقی دے کہ اِس کا نام دُنیا کے پہلے بہترین رسائل میں شامل ہو۔ جنوری کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تحریریں "رحمت پورا کا الٰہ دین" اور "چیتا" بہت خوب تھیں۔ (اسامہ خان، بہاول پور)

جنوری کا شمارہ بہت دل چسپ تھا۔ اس شمارے سے سیکھنے کو بہت کچھ ملا ہے۔ (نوید حسین، لاہور)

جنوری کا شمارہ بہت دل چسپ تھا۔ درسِ قرآن وحدیث عمدہ تھا۔
(سید عبدالاحد، فیصل آباد)

جنوری کے شمارے میں کہانیاں میرا نام ہے دودھ، بوجھ اور خزانہ بہت پسند آئیں۔ میں نے کہانی لکھی ہے، کیا میں بھیج سکتی ہوں؟ خدا کرے کے آپ کا شمارہ یوں ہی ہر ماہ علم کی روشنی پھیلاتا رہے۔ (مریم شفیق، لاہور)

☆ کہانی بھیجنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔

جنوری کا سرورق بہت خوب صورت تھا۔ کہانیوں میں مضبوط رسی، تتلی پیاری تتلی، ٹیوشن آپی اور رحمت پور کا الٰہ دین اچھی لگیں۔ مجھے سلسلہ دماغ لڑاؤ میں تیسرا انعام ملا تھا۔ انعام مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ (غالیہ ارم، لاہور)

☆ آپ کو انعام جلد بھیج کر دیا جائے گا۔

انکل! مجھے تعلیم وتربیت پڑھتے ہوئے سات سال ہو گئے ہیں۔ جنوری کا شمارہ حسبِ معمول اچھا تھا۔ آپ رمشاء 007 کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ (نورالعین، راول پنڈی)

☆ جنوری میں "سراغ مل گیا" اسی سلسلے کی ایک کہانی تھی۔

تعلیم وتربیت بہت اچھا رسالہ ہے۔ میں اس میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں اور ہونہار مصور کے سلسلے میں شامل ہو رہی ہوں۔ اُمید ہے آپ کو میری مصوری پسند آئے گی۔
(سیدہ نمرہ اجمل، فاروق آباد)

مجھے تعلیم وتربیت بہت اچھا لگتا ہے۔ (صفورہ اصفی، کراچی)

امتحان

محمد فاروق دانش (حیدر آباد)

"تو تم بتا سکتے ہوں کہ وائرلیس، دراصل کس نظام کے تحت کام کرتی ہے؟"

کڑک دار آواز کے حامل شخص نے نپے تلے الفاظ میں جب اُس سے سوال کیا تو وہ ایک دم چونک سا گیا۔

"جی سر، وہ..... وائرلیس..... بغیر تار کے آوازوں کو ایک جگہ سے دُوسری جگہ پہنچانے کا نام ہے۔" اس نے اپنے اندر ہمت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحب زادے! یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔"

انہوں نے نہایت سنجیدگی سے پین کے نچلے سرے کو ہونٹوں کی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

"وہ سر..... جی....." اُس نے بہت کچھ کہنا چاہا، لیکن سوالات کرنے والے کے رویے نے اُسے بہت پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اِس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"اچھا چلو، یہ بتاؤ کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب کیا تھے؟"

"جی سر..... بد انتظامی..... عیش و عشرت..... سلطنت کے اُوپر نہ توجہ ہونا....." اُس نے تقریباً تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

اب سے کچھ دیر پہلے تک وہ فر فر جواب دے رہا تھا، لیکن صدیقی صاحب نے جیسے ہی سوالات شروع کیے، وہ نروس ہو کر رہ گیا۔ چار پانچ سوالوں میں سے دو تین کے تسلی بخش جواب اُس نے دیے۔ باقی میں وہ صرف "یس سر..... جی سر۔" کر کے رہ گیا۔

انٹرویو لینے والے چار افراد تھے۔ اس میں صدیقی صاحب پینل کے چیئرمین تھے۔ ایک ماہر مضمون اور باقی دو ممبران۔ جب تینوں ممبران نے سوالات کیے تو مقیم نے نہایت پُر وقار انداز میں جوابات دے کر انھیں متاثر کیا۔ وہ لوگ جب مطمئن ہو گئے تو حتمی رائے کے لیے انہوں نے چیئرمین کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اس کا امتحان لے لیں۔

صدیقی صاحب، ایک سنجیدہ، باوقار اور اصولوں پر جان والے انسان تھے۔ وہ اپنے معاملات میں بے حد محتاط رہتے تھے، اسی لیے ریٹائرمنٹ کے بعد حکومت نے انھیں کمیشن میں چیئرمین کے طور پر تین سال کا کنٹریکٹ دیا تھا، جس کے فرائض وہ بہ احسن طریق نبھا رہے تھے۔

"سر! ہمارے خیال میں ان تین امیدواروں نے سب سے

بہترین انٹرویو دیا ہے۔"

ایک ممبر نے اپنی فہرست صدیقی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جی سر! ان چالیس امیدواروں میں یہ دس، امیدوار ساٹھ سے اُوپر نمبر لے سکے ہیں۔"

دُوسرے ممبر نے بھی اپنی لسٹ پیش کی۔

"اور یہ اُوپر والے تین سب سے بہتر ہیں اور چوں کہ ہمیں تین لیکچرر بھرتی کرنے ہیں، اس لیے یہ تینوں مناسب رہیں گے۔"

ماہر مضمون نے بھی اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا۔

صدیقی صاحب نے پہلے ان تینوں ممبران کی فہرست اور بعد میں اپنی مرتب کردہ فہرست پر نظر ڈالی۔

"یہی دس امیدوار میری لسٹ میں بھی سرفہرست ہیں لیکن....." انہوں نے پھر لسٹوں کا موازنہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایک واضح فرق ہے ان کی ترتیب میں....."

"وہ کیا سر؟" ایک ممبر نے جھک کر ان کی فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ مقیم نامی امیدوار میرے معیار کی لسٹ میں چوتھے نمبر پر ہے جب کہ....."

"نہیں سر! اس نے تو ہمیں بے حد متاثر کیا، اس لیے ہم تینوں نے اسے سب سے زیادہ نمبر دیے ہیں۔"

پہلے ممبر نے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں نے اسے زیادہ نمبر نہیں دیئے۔" صدیقی صاحب نے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لڑکے میں ابھی خود اعتمادی کی کمی ہے۔"

"نوجوان ہے سر! ملازمت میں آئے گا تو سیکھ جائے گا سب کچھ....." دُوسرے ممبر نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ہمیں کوشش کرنا ہو گی کہ یہ مزید محنت کرے۔" وہ بولے۔

انہوں نے دیوار پر نظر ڈالی۔ اپنی آنکھوں کو مسلا اور پھر دوبارہ لسٹوں کا موازنہ کرنے لگے۔

"سر! ہم لوگ انتہائی ایمان داری کے ساتھ یہ نتائج مرتب کر رہے ہیں، اس لیے ہمیں مقیم جیسے لڑکوں کو موقع دینا ہو گا۔"

"مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے، مگر وہ مجھے مطمئن نہیں کر پایا اس لیے....."

وہ نتائج کی حتمی فہرست تیار کرنے لگے، جس کی منظوری انہیں ہی دینا تھی۔ تینوں ممبران کا خیال تھا کہ مقیم ان تین افراد میں کھپ سکتا ہے، جنھیں وہ ملازمت دینے جا رہے ہیں لیکن صدیقی صاحب کے خیال میں وہ چوتھے نمبر کا اہل تھا۔ وہ جانتے تھے کہ صدیقی صاحب سے کی گئی کسی بھی بحث کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہونا، اس لیے انہوں نے چیئرمین کی رائے کو برتر جانتے ہوئے مقیم کو ویٹنگ لسٹ میں ڈال کر دیگر تین اہل امیدواروں کے نام سرکار کو سفارش کے طور پر ارسال کر دیے۔

صدیقی صاحب جب وہاں سے اٹھے تو انتہائی مطمئن اور مسرور تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور اُن سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

---☆☆---

"آج مقیم بے حد مطمئن لوٹا ہے۔" بیگم صاحبہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھیں۔

"اچھا۔" وہ بولے۔

"اُس کا کہنا ہے کہ وہ یقیناً منتخب ہو جائے گا۔" بیگم صاحبہ سرشاری کے عالم میں بول رہی تھیں۔

"یہ تو ان صاحب زادے کا خیال ہے نہ....." وہ سنجیدگی سے بولے۔

"تو کیا آپ مقیم کے اس گمان سے اتفاق نہیں کرتے؟" ان کی بھنوئیں تن گئیں۔ وہ سخت لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"ہاں! ابھی اس کو مزید محنت کرنا ہو گی۔" انہوں نے گویا اپنی اٹل رائے پیش کر دی۔

"اب بھی محنت کی ضرورت ہے میرے بیٹے کو....." بیگم صاحبہ کی پتلیاں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اُس نے دن رات ایک کر کے پڑھائی کی۔ یونی ورسٹی سے امتحان میں اے گریڈ حاصل کیا۔"

"آپ ٹھیک فرما رہی ہیں۔" انہوں نے کچھ ملائمت اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"اب جب کہ اُس کا انٹرویو ہونا تھا تو وہ کئی دنوں سے پڑھ رہا تھا۔ اُس کا ٹیسٹ بھی اچھا ہوا تھا" وہ روہانسی ہو کر بولیں، "پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اچھے نمبر نہ لے سکے۔"

"اُس کی محنت اپنی جگہ پر..... لیکن آپ یہ کیوں بھولتی ہیں کہ ہمارے ہاں ایسے ہزاروں ہنر مند افراد ہیں جو دن رات ایک کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہیں۔" وہ انہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ "وہ بھی امتحان دیتے ہیں محنت کر کے۔"

"رہنے دیجئے امی! ابو سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔" اچانک مقیم کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے امی اور ابو کے درمیان ہونے والی کچھ باتیں سن لیں تھیں۔

"کیوں؟ میں کیوں دلائل نہ دوں تمہاری حمایت میں!" وہ اُس سے اُلجھنے لگیں۔ "کیا میں تمہاری دن رات کی محنت نہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر تم کیسے رہ سکتے ہو سلیکشن سے۔"

"اِس کی محنت بجا ہے، لیکن یہ صرف چار پانچ نمبروں کی وجہ سے رہ گیا ہے۔"

اچانک صدیقی صاحب نے ان پر بجلی گرا دی۔ ان کی بیگم کو اس نتیجے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے معلوم تھا امی کہ ابو اپنے اصولوں کی بھینٹ مجھے بھی چڑھا دیں گے" مقیم نے افسردگی سے کہا۔ "حال آں کہ میں نے ٹیسٹ وانٹرویو اچھا دیا تھا۔"

"تم شاید بھول رہے ہو کہ اس امتحان کا منصف میں تھا۔" صدیقی صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "مجھے اندازہ ہے کہ میرے پینل کے ممبران نے ولدیت میں میرا نام دیکھ کر تمہیں بہتر نمبر دے کر اُوپر بھی کر دیا تھا، لیکن....." وہ یہیں رک گئے۔

"لیکن..... لیکن کیا؟" بیگم صدیقی تقریباً چلا اٹھیں۔

یہ سن کر صدیقی صاحب خاموش ہی رہے۔

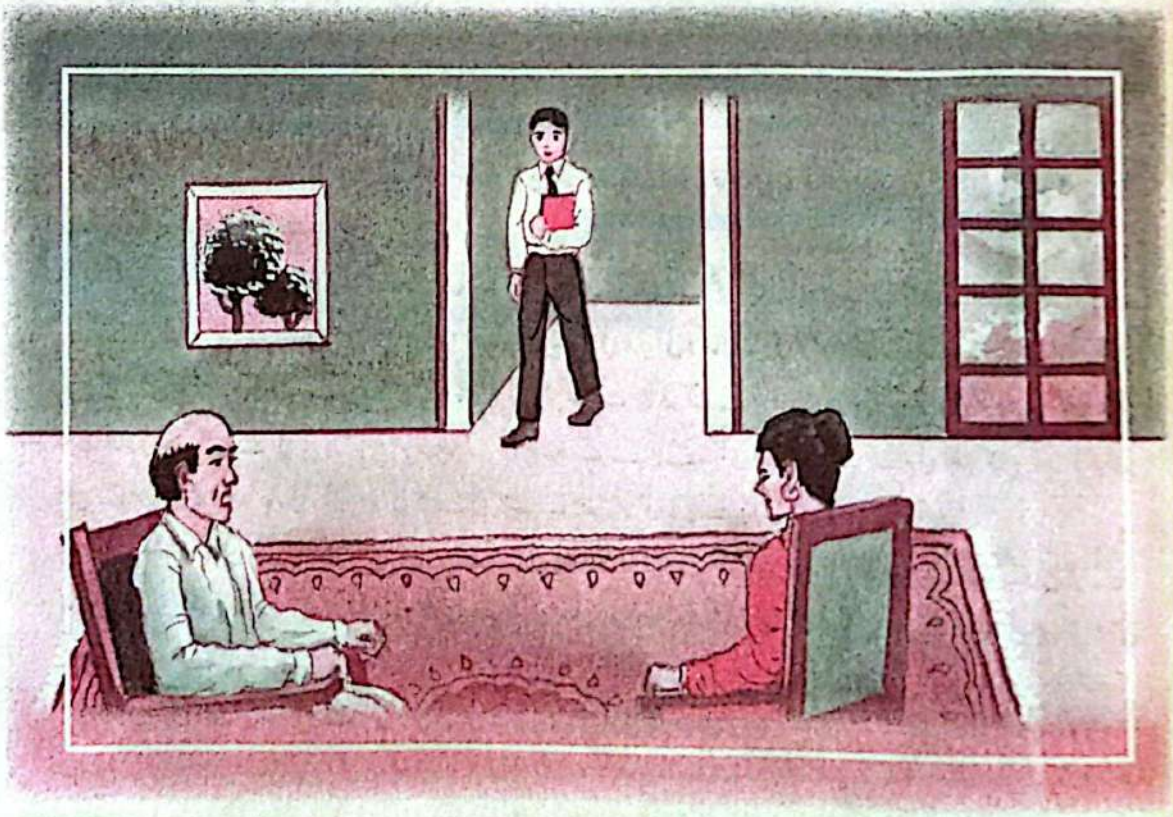

"قدرت نے آپ کو ایک بہترین موقع فراہم کیا تھا کہ آپ اپنی اولاد کو آگے نکال دیتے، مگر افسوس صدیقی صاحب! آپ نے ایسا نہ کیا۔"

"تم شاید ٹھیک کہتی ہو بیگم! ایک لمحے کو میرے دل میں بھی اسے اُوپر کر دینے کا خیال آگیا تھا۔" صدیقی صاحب نے اپنے دل کی بات بتاتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ نے مجھے منتخب کیوں نہیں کیا؟" مقیم کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"تمہارا مستقبل روشن ہو گا بیٹا!" وہ اُسے حوصلہ دیتے ہوئے بولے۔ "تمہیں اس ہار کے بعد مزید محنت کی عادت پڑ جائے گی اور تم آئندہ اتنی حوصلہ مندی سے جواب دو گے کہ کوئی بھی تمہارا راستہ نہیں روک سکے گا۔"

"اگر یہ اس بار منتخب ہو جاتا تو کیا مسئلہ تھا۔" بیگم صدیقی نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔

"بیگم! قرآن میں فرمان الٰہی ہے کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل سے کام لو، گو کہ مجھے اِسے منتخب کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، لیکن میرا دل جانتا ہے کہ میں نے مقیم سے بہتر لڑکوں کا انٹرویو کیا ہے۔ اگر میں انھیں نیچے کر دیتا تو ان کی حق تلفی ہو جاتی اور روزِ قیامت مجھے کون بچاتا؟"

ان کے لفظوں میں بلا کی سچائی تھی۔ صدیقی صاحب کی ان باتوں کے بعد بیگم صدیقی اور مقیم کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ مقیم اپنے والد کے لفظوں کی سچائی کے بعد ایک نئے امتحان سے گزرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

پتھر

ایک بادشاہ نے بڑا سا پتھر لیا اور اُسے اُس جگہ رکھ دیا، جہاں لوگوں کی آمدورفت ہوا کرتی تھی اور خود جا کر ایک گوشے میں چھپ گیا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کون آکر اِس بڑے پتھر کو راستے سے ہٹاتا ہے۔

ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ چند افراد کا وہاں سے گزر ہوا، جو بادشاہ کے دربار میں بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ وہ اس پتھر کے نزدیک آئے اور اسے بیچ سڑک میں پڑا دیکھ کر افسوس کا اظہار کیا اور پتھر ہٹائے بغیر یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے کہ بادشاہ کو اپنی رعایا کا خیال رکھنا چاہیے۔

بادشاہ یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتا اور سنتا رہا، لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے درباریوں یا رعایا میں سے کون ہے جسے عوام کا خیال ہے۔

کچھ دیر بعد ایک کسان وہاں سے گزرا، جس نے اپنی پشت پر سبزیاں لاد رکھی تھیں۔ وہ جب اس پتھر کے نزدیک آیا تو اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، جب کہیں سے کوئی مدد آتی دکھائی نہ دی تو خود اُس نے سامان اپنی پشت سے اُتار کر نیچے زمین پر رکھ دیا۔ اِس کے بعد اُس نے پتھر کو بیچ سڑک سے ہٹا کر کنارے پر ڈالنے کی کوشش شروع کر دیں، لیکن پتھر بہت بھاری تھا۔ اس نے کئی بار اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی کو مدد کے لئے بلالے، لیکن وہاں دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ آخر کار اُس نے خود ہی جدوجہد جاری رکھی اور کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد پتھر کو وہاں سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔

جب وہ اپنا سامان اٹھانے کے لئے زمین پر جھکا تو اُس نے دیکھا کہ زمین پر جس جگہ وہ پتھر رکھا تھا، وہاں ایک تھیلی پڑی تھی۔ کسان نے تھیلی اٹھا کر دیکھی تو وہ سونے کے سکوں سے بھری ہوئی تھی اور ساتھ ایک خط بھی تھا، جس پر نیچے بادشاہ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ خط میں لکھا تھا۔

"اِس تھیلی میں موجود تمام سکے اُس شخص کی ملکیت ہیں جو اس وزنی پتھر کو اٹھائے گا۔"

(سید توشیق حیدر، جھنگ)

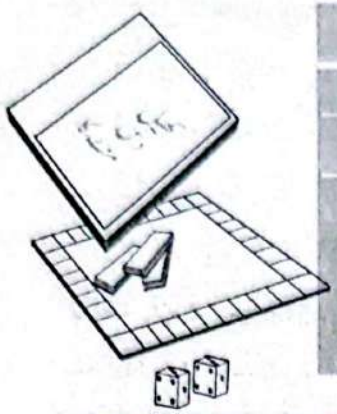

کھیل دس منٹ کا

چ	ک	و	ا	ل	پ	ش	ا	و	ر
د	ع	ن	غ	ک	ا	ٹ	ک	خ	س
ل	ش	ح	ا	ط	م	ن	ح	پ	ی
م	چ	ب	م	ج	ل	ف	ش	ط	ا
ر	ا	ل	ٹ	ع	ن	ل	ث	س	ل
ی	ق	ص	و	ر	ح	پ	ن	ی	ک
ک	ر	ا	چ	ی	ہ	غ	و	ت	و
ح	ک	و	ٹ	ا	د	و	م	ر	ے
ز	ی	ا	ر	ت	س	گ	ے	ز	ف
ٹ	ر	و	ش	م	ر	ی	ے	ر	ے

آپ نے حروف ملا کر پاکستان کے دس شہروں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان شہروں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں اور اُوپر سے نیچے تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن شہروں کو آپ نے تلاش کرنا ہے ان کے نام یہ ہیں:۔

کراچی، سیال کوٹ، زیارت، پشاور، قصور، چکوال، اٹک، مرید کے، کوٹ ادو، مری۔

بلا عنوان کے کچھ عنوانات بغیر انعامات کے

☆ جان جاتی ہے تو جائے، مگر پتنگ ہاتھ سے نہ جائے۔
(محمد شعیب، عبداللہ سیال کوٹ)

☆ ایک شکار، دو اُمید وار۔
(محمد ضیاء اللہ، میاں والی)

☆ یہ ہیں اکیسویں صدی کے پتنگ باز
(فہد فاروق، ملتان)

☆ جو جیتا، وہی سکندر
(محمد فہد خالد، کراچی)

☆ پتنگ ہماری، جان سے پیاری
(ماریہ طارق، روال پنڈی)

☆ پائلٹ انکل! ذرا ٹھہرنا ذرا ہم پتنگ پکڑ لیں۔
(محمد سعید الحسن، سکھیکی منڈی)

☆ پتنگ پکڑنے کا جدید طریقہ۔
(محمد طہ، کراچی)

☆ نئے دور کی نئی بسنت۔
(عبدالرحمٰن، لاہور)

☆ جہاز سے گرا، پتنگ میں اٹکا۔
(محمد مبین احمد، ساہی وال)

☆ ہم تو چلے ہواؤں کے سنگ، جیسے کوئی اڑتی پتنگ۔
(ارم نسیم خان، کراچی)

☆ جہاز کی سیر کو چھوڑو پتنگ پکڑو۔
(اسامہ طارق، راول پنڈی)

☆ پتنگ لوٹنے کا مزہ تو اب آیا ہے۔
(اسد فاروق، ملتان)

☆ باکمال لوگ، لاجواب سروس۔
(مرزا فرحال بیگ، حیدر آباد)

☆ نیا زمانہ، نیا انداز۔
(محمد احمد خان، گوجرانوالہ)

☆ جنون اِسی کو کہتے ہیں۔
(اُسوہ منصور، سیال کوٹ)

☆ 2010ء کے پتنگ باز۔
(عدیل اصغر، بہاول پور)

☆ بھائی! اس میں میرا بھی حصہ ہے۔
(نبیل مختار، گجرات)

☆ جان جائے، پتنگ نہ جائے۔
(متین منور، فیصل آباد)

☆ یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے۔
(حافظہ سیرت فاطمہ، فیصل آباد)

☆ دیکھو! پتنگ بازی کا شوق۔
(حافظہ خولہ طاہر، فیصل آباد)

☆ ہوائی لٹیرے۔
(آسیہ طاہر، کوئٹہ)

☆ نیا سال، نئی سوچ۔
(عبدالستار خان، ایبٹ آباد)

☆ طریقہ لاجواب، جیت بے مثال
(ہارون الرشید، جہلم)

☆ ارے جگو! آجہاز کے ساتھ ریس لگائیں۔
(میمونہ ساجد، راول پنڈی)

☆ دم ہے تو سامنے آ۔
(محمد فواد خالد، کراچی)

☆ ایک تیر سے دو شکار۔
(معاذ احمد صدیقی، میاں والی)

☆ یوں لوٹیں گے پتنگ، دُنیا رہ جائے گی دنگ۔
(فاطمہ مرتضیٰ، فیصل آباد)

☆ زمانے کے انداز بدلے گئے۔
(کنول اشرف، گوجرانوالا)

☆ 2010ء کے جدید لٹیرے۔
(اظہر علی، سکھیکی منڈی)

☆ یہ ہے پتنگ پکڑنے کا صحیح طریقہ۔
(عزیز احمد، فیصل آباد)

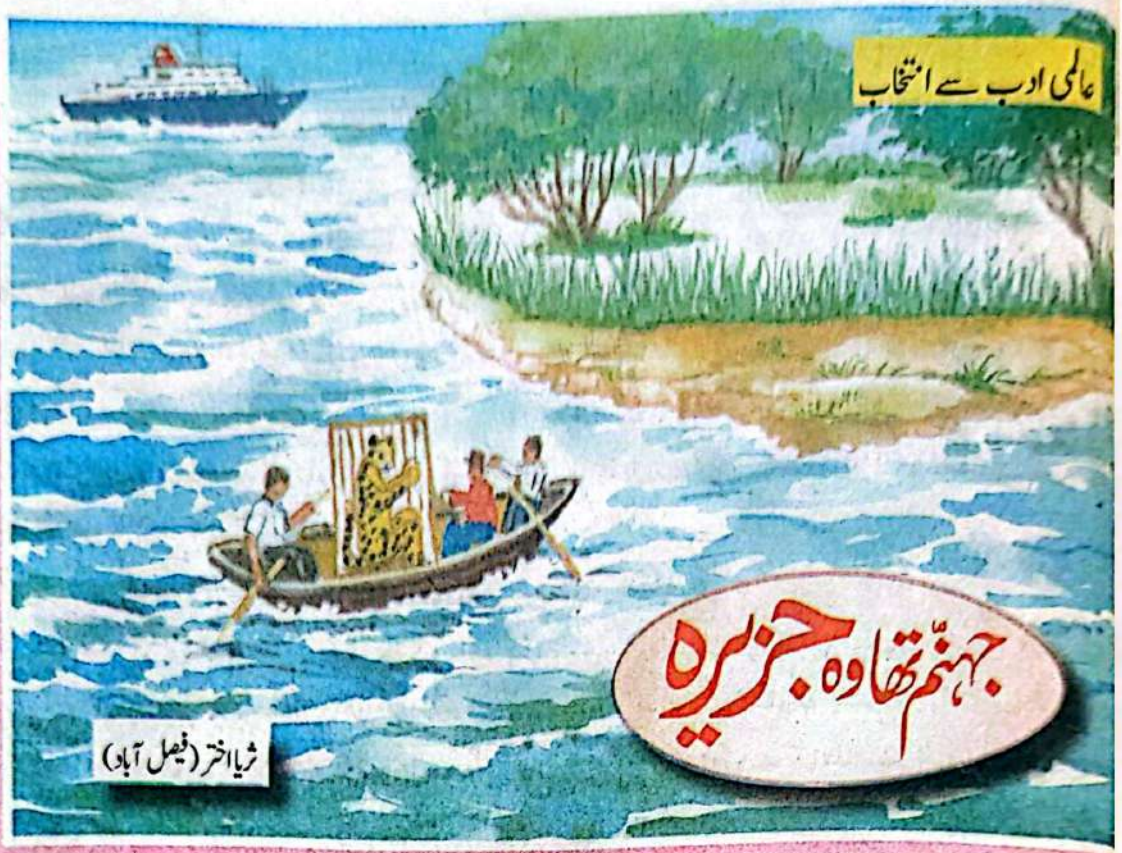

جہنّم تھا وہ جزیرہ

ثریا اختر (فیصل آباد)

تعارف

انگریزی کے ادیب ایچ جی ویلز کا مشہور ناول ہے The Island of Dr. Moreau یعنی ڈاکٹر موریو کا جزیرہ۔ اس ناول میں ڈاکٹر موریو بہت سے جانوروں کو اپنے علم کی بنا پر انسانوں میں بدل دیتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ بیل صرف بیل گاڑی نہ کھینچیں، کتے صرف گھروں کی حفاظت نہ کریں بلکہ کچھ اور کر دکھائیں، بندر تماشا نہ کریں بلکہ معاشرے کا فعال رُکن بن جائیں اور ملوں کی مشینیں چلائیں۔ در حقیقت ایسا ممکن نہیں۔ ہم جانوروں کو تربیت دے کر اُن کی صلاحیتوں سے فائدہ تو اٹھا سکتے ہیں مگر انہیں اشرف المخلوقات کا درجہ نہیں دے سکتے۔ ایسا کرنا قانونِ قدرت کے خلاف ہے اور قدرت کے مخالف اقدامات کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ عالمِ ادب سے انتخاب کرتے ہوئے ویلز کے اس شاہ کار سائنسی ناول کا خلاصہ مناسب ترمیم کے ساتھ بچوں کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔

اس ناول پر ایک انگریزی فلم بھی بن چکی ہے۔ اس کا بھی یہ ہی نام تھا یعنی دی آئس لینڈ آف ڈاکٹر موریو۔ جدید تکنیک اور کمپیوٹر کی مدد سے بنی اس فلم پر خاصا خرچ اٹھا تھا۔

وہ جزیرہ تو بہت حسین تھا، مگر خوف ناک اُس سے بھی زیادہ۔ میں اپنی کہانی شروع سے سناتا ہوں۔ مجھے ہوش آیا تو میں ایک کیبن کے نرم بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میں بہت خوش ہوا کہ میری جان بچ گئی سو لاکھوں پائے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو کمزوری کی نقاہت سے لرز کر رہ گیا۔ بستر اور کیبن ہولے ہولے جھولے کھا رہا تھا..... میں کسی بحری جہاز پر تھا۔ پھر ایک لمبا تڑنگا آدمی اندر آیا۔ وہ بولا۔

"تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تم زندہ بچ گئے۔ تم کشتی میں نیم مردہ پڑے تھے کہ میری نظر جہاز کے عرشے سے تم پر جا پڑی تھی۔"

"شکریہ۔" میں کم زوری سے بولا۔

"میرا نام جیمز ہے اور تم؟" وہ بولا۔

"میرا نام پال ہے اور میں سکاٹ لینڈ سے ہوں۔"

پھر میں جیمز کا دوست بن گیا۔ وہ طب کا طالب علم رہ چکا تھا۔ اُس جہاز پر جو کہ اطالوی تھا۔ جیمز کے ساتھ ایک بوڑھا

بھی تھا، جس کا جسم مضبوط اور قد لمبا تھا۔ اُس نے مجھے ذرہ برابر اہمیت نہ دی۔ وہ تنہا بیٹھا پڑھتا لکھتا رہتا تھا۔ ان دونوں کے پاس ایک پنجرے میں بند تیندوا بھی تھا اور بہت سے شکاری کتے بھی۔ جہاز کے عرشے پر ان جانوروں نے خوب گندگی اور اودھم مچا رکھا تھا۔ اِس بات پر جہاز کا عملہ ان دونوں سے بہت نالاں تھے۔ جہاز کا کپتان بھی بے بس تھا ورنہ وہ تو ان دونوں کو اٹھا کر سر کے بل سمندر میں پھینک دیتا۔

ایک دن جیمز، بوڑھا اور کپتان آپس میں یوں الجھے کہ بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ میں نے آگے بڑھ کر معاملہ رفع دفع کرایا تو کپتان مجھے بھی برا بھلا کہنے لگا۔ آخر کار ایک دوپہر جہاز ایک جزیرے کے پاس جا رُکا۔ ان دونوں نے اپنے جانور ایک بڑی کشتی میں اتارے تو کپتان نے مجھے بھی ان کے ساتھ اترنے کا حکم دیا کہ وہ مجھے بھی اُن کا طرف دار سمجھ رہا تھا۔ وہ دونوں مجھ بے بس پر ترس کھا کر اپنے ساتھ لے چلے۔ جہاز ہم سے دُور اور ہم جہاز سے دُور ہوتے گئے۔ آخر کار ہم ایک جزیرے پر جا پہنچے۔ جیمز نے ساحل پر رُکتے ہی ایک عجب آواز منہ سے نکالی تو بن مانس جیسے عجیب الخلقت مرد دوڑتے چلے آئے۔ وہ دو پیروں پر چل تو رہے تھے، مگر صاف لگ رہا تھا کہ وہ کبھی جانور رہے ہوں گے۔

یہ مرد بہت قوی تھے، انہوں نے تیندوے کا پنجرا کسی پھول کی طرح اٹھا کر ایک ہتھ گاڑی پر رکھا اور چل دیئے۔ جیمز نے چار مردوں کو منوں وزنی بورے بھی اٹھوائے اور کتے نیچے اتار کر ہم بھی چل دیئے۔ یہ جزیرہ قدرتی حسن کا نمونہ اور اپنی خوب صورتی میں بے مثال تھا۔ اس کے ایک کونے میں ایک قلعہ تھا۔ ہم سب سامان اور تیندوا لے کر قلعے میں پہنچے۔ قلعے میں کچھ اور بھوت جیسے انسان موجود تھے۔ جیمز نے مجھے میرا کمرا دکھایا اور کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کے کاموں میں دخل نہ دینا ورنہ....."

پھر میرے بولنے کی گنجائش نہ رہی۔ میں سکاٹ لینڈ سے امریکا جاتے ہوئے یہاں آن پھنسا تھا، نہ میرا بحری جہاز طوفان میں تباہ ہوتا اور نہ میں کشتی میں نیم مردہ گر کر جیمز کی رحم دلی کا شکار ہوتا۔ ایک بھیانک مرد اندر آیا، اُس کے ہاتھوں میں کھانے کا تھال تھا۔ میں نے جیمز کے ساتھ مل کر خوب کھانا کھایا اور بستر پر گر کر ایسا سویا کہ دُوسری صبح پو پھٹتے ہی آنکھ کھلی۔

تب میں جزیرے کی سیر کے لیے چل دیا۔ اس جزیرے پر میوہ دار درختوں کی کثرت تھی۔ ہر طرف کیلے، ناریل اور انگور نظر آ رہے تھے۔ میں پھل کھاتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ٹھٹھک کر رہ گیا۔ میرے سامنے ایک شخص تھا جو شاید کبھی بیل رہا ہو گا۔ میں پھر چل دیا۔ مجھے انگوروں کی بیلوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ دو دبلے پتلے انسان جو بھیڑیا لگتے تھے، مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو میں گھبرایا پھر میں نے گرج کر کہا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟"

"کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں۔"

وہ گھبرا کر بولے اور پرے ہٹ گئے۔ میں فوراً قلعے کی طرف تیز قدموں سے چل دیا۔ اپنے کمرے کے پاس پہنچ کر میں نے سنا، جیمز کہہ رہا تھا۔

"ڈاکٹر موریو! تیندوا کب تک نیا روپ دھار لے گا؟ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

جواب میں بوڑھا موریو خاموش رہا تو مجھے یاد آ گیا کہ کبھی ڈاکٹر موریو دُنیا کا ماہر ترین جراح تھا۔ وہ جانوروں کو ترقی دے کر انسانوں کے قریب تر لانا چاہتا تھا۔ اِس کی لیبارٹری سے ایک ایسا ہی جانور بھاگ نکلا کہ جس کا روپ بدلا جا رہا تھا تو عوام کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی اور ڈاکٹر روپوش ہو گیا۔ جیمز نے میرے پوچھنے پر کہا۔

"ہاں یہ وہی ڈاکٹر موریو ہے اور اس کے تجربات مسلسل کام یاب ہو رہے ہیں۔ یہ آپریشنز سے جانوروں کے اجسام اور اذہان بدل ڈالتا ہے۔ اس جزیرے کے تمام جانور انسان نما حیوان بن چکے ہیں اور ہمارے مطیع ہیں۔ آخر کار اس تیندوے پر تجربات بھی کام یاب ہوں گے اور ڈاکٹر دُنیا کے چپے چپے میں جانا جائے گا۔ اس جہان کا بچہ بچہ ڈاکٹر کے ہی گن گائے گا۔"

مجھے جیمز کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ ڈاکٹر دُنیا سے چھپ کر، اس جزیرے میں جو تیر مار رہا تھا، وہ قدرت کے خلاف تھا۔ میں شام کو کھانا کھا کر سیر کے لیے نکلا تو پودوں کے پیچھے وہی بھیڑیا

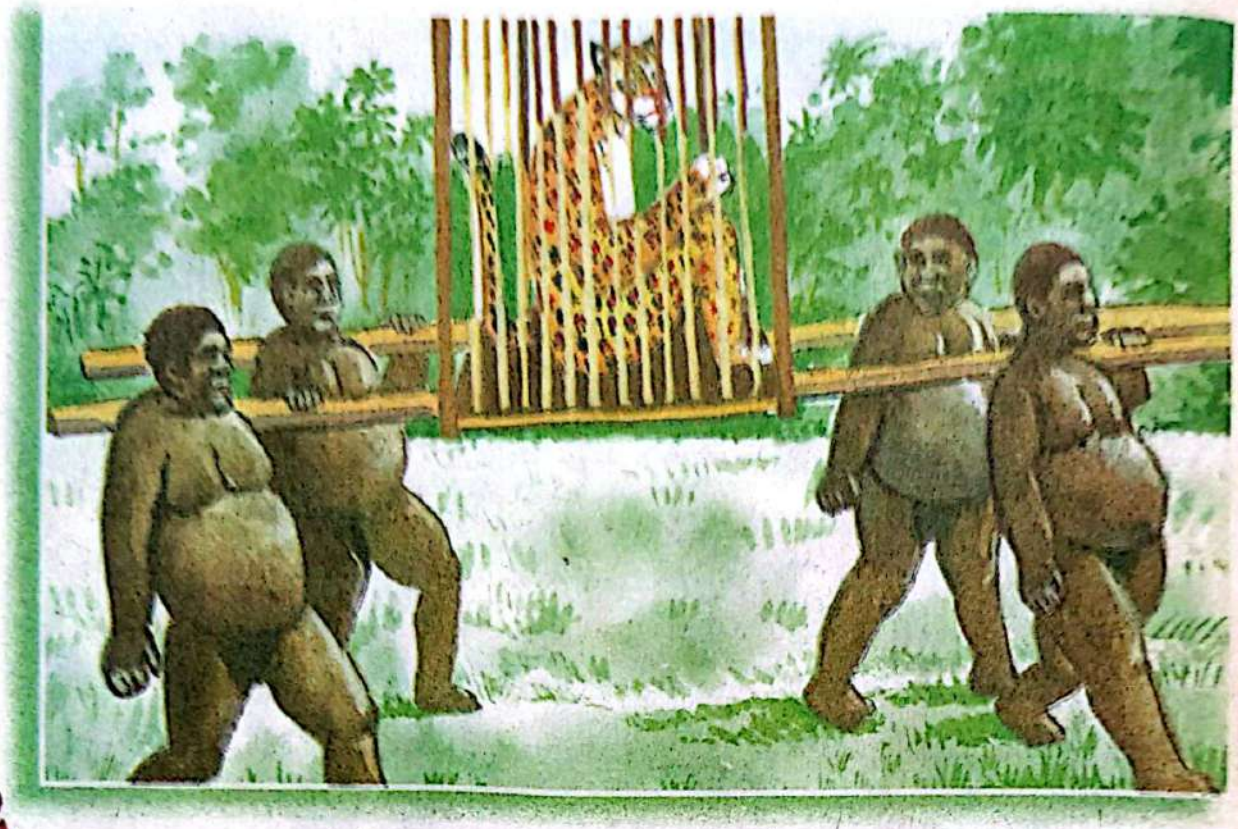

انسان ندی سے منہ لگا کر پانی پی رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ان کی جانوروں جیسی عادات ابھی باقی تھیں۔ کیلوں کے درختوں کے پاس حیوان نما انسانوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ ایک مخلوق جو کبھی گوریلا رہی ہو گی، لہک لہک کر سب کو قانون سکھا رہی تھی اور سب باجماعت اِس کا ساتھ دے رہے تھے۔

"چار ٹانگوں پر چلنا گناہ ہے، کیوں کہ ہم انسان ہیں، بغیر کپڑوں کے پھرنا گناہ ہے، کیوں کہ ہم انسان ہیں۔ دُوسرے پر حملہ کرنا گناہ ہے، کیوں کہ ہم انسان ہیں۔ قانون ڈاکٹر نے بنایا ہے، ہم قانون مانتے ہیں کہ ہم انسان ہیں۔"

میں وہاں جزیرے کے قلعے میں رہنے پر ہی بہ امر مجبوری راضی ہو گیا۔ میں جیمز اور ڈاکٹر کے کام کرتا، جزیرے کے پھل کھاتا اور کتے لے کر خرگوشوں کا شکار کرتا تھا۔ کچھ ماہ بعد تیندوا بھی انسان کی طرح دو پیروں پر چلنے اور باتیں کرنے لگا۔ ڈاکٹر اب بغلیں بجاتا پھرتا تھا۔ اب وہ ساری دُنیا کے صحافی بلا کر اِس جزیرے میں پریس کانفرنس کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کی خوشی عارضی تھی۔ ایک دو دن کے بعد تیندوے نے ڈاکٹر کو اٹھا کر کرسی سے فرش پر دے مارا اور اس کی کافی کا مگ اس کے سر پر پٹخ کر غراتا ہوا بھاگ نکلا۔ ڈاکٹر بھی اس کا تعاقب کرنے نکلا۔

میں نے بے سدھ ہوتے ہوئے جیمز کو جگایا تو ہم دونوں بھی اسلحہ لے کر ڈاکٹر کی مدد کو نکلے۔ ڈاکٹر ملا اور نہ تیندوا۔ ایک ہرن آدمی کی نشان دہی پر ہم گھنی جھاڑیوں کے پیچھے گئے تو حیوان انسانوں کا جمِ غفیر دائرہ بنائے کھڑا تھا۔ درمیان میں تیندوا اور ڈاکٹر دونوں مرے پڑے تھے کہ ایک لگڑ بھگڑ آدمی تیندوے کا خون چاٹ رہا تھا۔ میں نے لگڑ بھگڑ آدمی ڈرا مار کر بھگایا تو وہ غرا کر پرے چلا گیا۔ ڈاکٹر اس کی فطرت مکمل طور پر بدل نہ سکا تھا۔

گینڈے آدمی نے اعلان کیا۔ "قانون بنانے والا مر چکا ہے لہٰذا قانون بھی ختم ہوا۔" تب ان حیوان نما انسانوں نے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا۔

جیمز نے فوراً ہوائی فائرنگ کی تو سب ٹھنڈے پڑ گئے۔ قانون ساز مرا نہیں بلکہ تم سب کو جانچنے کے لیے ذرا خاموش ہو گیا ہے۔ پھر ہم نے اپنے چابک لہرا کر انہیں منتشر کیا اور ڈاکٹر کو تیندوے سمیت قلعے کے باغ میں دفن کیا تاکہ ہمارا دبدبہ اُن پر قائم رہے۔

جیمز میں ایک بہت بری عادت تھی کہ وہ نشہ کر کے عقل وہوش سے بے گانہ ہو جاتا تھا۔ ایک رات اس نے نشہ کیا اور اوٹ پٹانگ بولنے لگا۔ پھر وہ دل دہلا دینے والی چیخیں بلند کرنے لگا۔ تب میں کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ آدھی رات کو بے تحاشا فائرنگ ہوئی۔ میں لپک کر باہر نکلا۔ ایک جگہ پر ریچھ جیسے انسانوں کے ساتھ جیمز بھی مردہ پڑا تھا۔

پھر اس جزیرے کے حالات میرے لئے جہنم سے بھی بدتر ہوتے چلے گئے۔ حیوان نما انسان میرے احکامات سے روگردانی کرنے لگے۔ حیوانی اور فطری عادات اُن کے اندر دوبارہ آگئیں۔ کچھ چاروں پیروں پر چلنے لگے۔ کچھ آپس میں الجھ پڑے اور ایک دو کو کھا گئے۔ گینڈے آدمی نے ایک درخت مجھ پر گرانے کی کوشش کی تو لگڑ بھگڑ آدمی نے مجھے نوالہ بنانا چاہا۔ میں ہر وقت اپنے ساتھ اسلحہ اور کتے رکھتا تھا۔ قلعے کے باورچی خانے کا سامان ختم ہو رہا تھا۔ کوئی بھولا بھٹکا جہاز بھی اِدھر نہیں آتا تھا۔

تمام جانور پھر جانور بن چکے تھے اور سارا دن جزیرے پر دھینگا مشتی کرتے تھے۔

آخر کار میں نے کشتی میں بہت سے ذبح خرگوش، پانی اور کھانے کا سامان رکھ کر جزیرہ چھوڑ دیا۔ میں سوتا جاگتا اور ناؤ کھینچتا رہا۔ آخر کار میں نے ایک بحری جہاز پالیا اور یوں اپنے وطن واپس پہنچا۔

اب میں بہت بوڑھا چکا ہوں۔ لوگ اب بھی میری کہانی پر یقین نہیں کرتے، حال آں کہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اب میں ہر انسان کو دیکھ کر یہ ہی سوچتا ہوں کہ اگر ہر انسان واقعی انسانیت پر فائز ہو جائے تو جانوروں کو انسان بنانے کی کبھی احمقانہ کوشش نہیں کی جائے گی۔

میں ہوں فرسٹ پوزیشن

نعیم شاہد، اوکاڑہ

جی ہاں، یہ میں ہوں۔ ہر طالب علم کی سب سے بڑی خواہش، اُس کا خواب میں ہی ہوں۔ ہر طالب علم چاہتا ہے کہ میں صرف اُسی کے پاس آؤں کیونکہ جن کے پاس میں جاتی ہوں، اُن کی عزت اور وقار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ گھر والے اُن کی بڑی آؤ بھگت کرتے اور ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔ جن طالب علموں کے پاس میں جاتی ہوں، وہ اپنے اساتذہ کی آنکھ کا تارا بن جاتے ہیں۔ جی ہاں، میں فرسٹ پوزیشن ہوں۔ امتحانات میں ہر طالب علم چاہتا ہے کہ مجھے حاصل کر لے کیونکہ میں اُن کا خواب ہوں اور وہ مجھے پانے کے لئے دن رات محنت کرتے ہیں۔ اُن کے استاد اُنہیں جو بھی سبق پڑھاتے ہیں، جس چیز کا بتاتے ہیں، وہ اُسے بڑی محنت اور لگن سے یاد کر کے اپنے دماغ میں بٹھا لیتے ہیں۔ اپنے سکول کا روز کا کام روز کرتے ہیں، فارغ نہیں رہتے اور نہ ہی خواہ مخواہ آوارہ پھرتے ہیں۔ وہ وقت پر پڑھتے اور وقت پر ہی کھیلتے ہیں اور آخر مجھے حاصل کر لیتے ہیں۔

دُوسری جانب ایسے طالب علم بھی ہیں جو مجھے حاصل تو کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ ٹھیک سے پڑھتے ہی نہیں۔ سکول کا ہوم ورک وہ کبھی کبھار ہی کرتے ہیں، کلاس میں ہونے والے ٹیسٹ میں اکثر فیل ہی ہوتے ہیں، نہ وہ کلاس میں اچھی طرح پڑھتے ہیں اور گھر میں تو اُن سے پڑھنے کی اُمید کرنا ہی فضول ہے۔ جب اُن کے امی ابو انہیں پڑھنے کے لئے کہتے ہیں تو وہ بہانے بنانا شروع کر دیتے ہیں اور زیادہ تر سکول سے غیر حاضر ہی رہتے ہیں۔ پھر بھی ان کی خواہش ہوتی ہے کہ میں اُن کے پاس چلی جاؤں۔ میں نے اُن کے پاس کیا جانا ہوتا ہے بلکہ وہ تو بے چارے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں۔ ایسے طالب علموں کو ہمیشہ مجھ سے شکوہ رہتا ہے کہ میں اُن کے پاس کیوں نہیں آتی۔ میری ایسے تمام ساتھیوں سے عرض ہے کہ میں تو خود ان کے پاس آنا چاہتی ہوں، لیکن مجھے پانے کے لیے وہ خود بھی تو کچھ کریں۔ میرا اتنا اختیار نہیں ہے کہ میں جس کے پاس جانا چاہوں، خود ہی چلی جاؤں۔ میں تو صرف انہی طالب علموں کے پاس جاتی ہوں جو مجھے پانے کے لئے خلوص دل سے محنت کرتے ہیں۔

اس لیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ اِس سال میں آپ کے پاس آؤں تو آج سے ہی محنت شروع کر دیں اور نتیجے کے دن آپ مجھے اپنے پاس پائیں گے۔

ہونہار مصور

تصاویر صرف انتی رنج میں ہی بنائیں

ہوائی جہاز

ریمام عبدالعلیم، کراچی (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

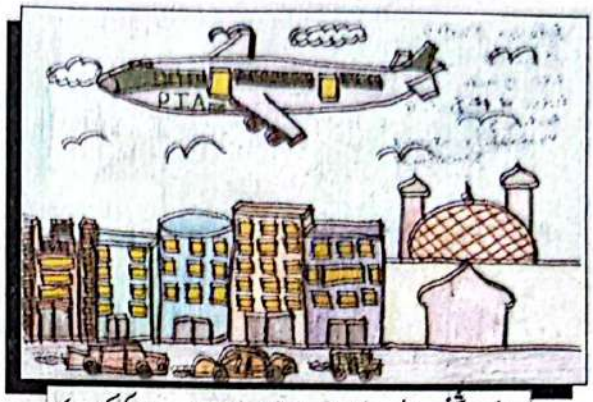

عائشہ شیخ، راول پنڈی (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

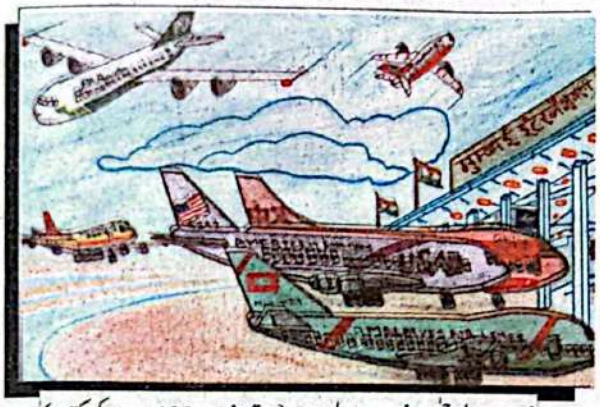

محمد اسد الرحمٰن انور، بہاول پور (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

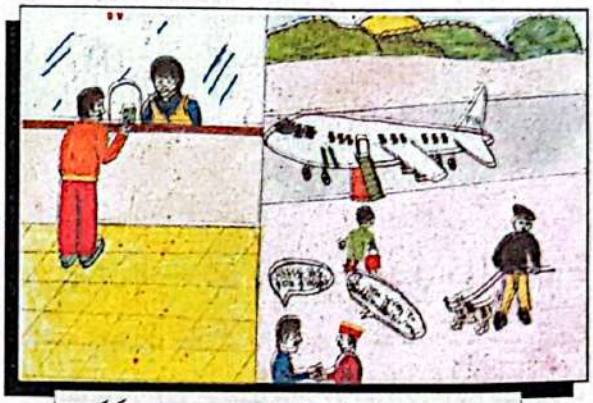

ضرغام احمد خان، ملتان (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

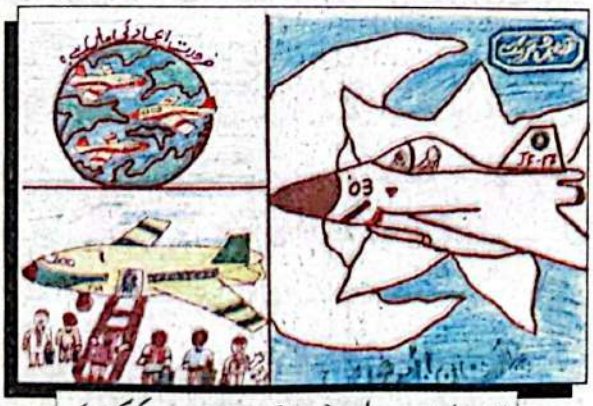

ہاجرہ سلطان، رسالپور (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

سیدہ نمرہ اجمل، شیخوپورہ (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: طاہر وسیم گجرات۔ وقاص مصطفیٰ شورکوٹ۔ سلطان فاروقی قصور۔ شفق شیکی اقبال سیال کوٹ۔ ثوبیہ انجم، قرأۃ العین آزاد کشمیر۔ عاصم جاوید، غالیہ ارم، اسجد وقار، مہک نفیس صدیقی، مریم شفیق لاہور۔ عاقب رباب، محمد علی چکوال۔ عروسہ حنیف، صبا عمر حیدرآباد۔ صبغت اللہ قاضی منڈی بہاؤالدین۔ منیب داؤد، شمع عرفان، غلام جیلانی جہلم۔ عادل انیس، شمع منظور، ایمن سہیل راول پنڈی۔ حاشر احمد، انس نسیم، شفیق بھٹی کراچی۔ سروش مرتضیٰ، سرگودھا۔ محمد ریحان ڈیرہ غازی خان۔ سعد فاروق ملتان۔ طہورہ ناصر، صبورہ ناصر ساہی وال۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 فروری

مارچ کا موضوع: میرا پاکستان

آخری تاریخ 8 مارچ

اپریل کا موضوع: درخت ہمارے دوست

میری زندگی کے مقاصد

عاقب رباب، چکوال

ڈاکٹر بن کر ملک اور قوم کی خدمت کرنا میری زندگی کا مقصد ہے۔

محمد عثمان ظفر، کراچی

میں پڑھ لکھ کر استاد بنوں گا اور علم کی روشنی پھیلاؤں گا۔

سید محمد لویس وسیم، لاہور

میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

علی رضا بھٹی، جلال پور جٹاں

میں سی ایس پی افسر بن کر قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

آمنہ الیاس، فیصل آباد

میں بڑی ہو کر آرمی ڈاکٹر بنوں گی تاکہ فوجی بھائیوں کی خدمت کر سکوں۔

محمد اسامہ خان، بہاول پور

مجھے کرکٹ کا بہت شوق ہے میں بڑا ہو کر کرکٹر بنوں گا۔

احتشام ساجد، راول پنڈی

میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور ملک کی ترقی میں حصہ لوں گا۔

اسامہ بن شفاعت، سوہاوہ

میں انصاف پسند مصنف بن کر غریبوں کو انصاف فراہم کروں گا۔

اسد بھٹی، لاہور

میں پولیس میں جاؤں گا اور دہشت گردوں کو گرفتار کروں گا۔

حمزہ صدیقی، لاہور

میں بڑے ہو کر چائلڈ سپیشلسٹ بننا چاہتا ہوں تاکہ بچوں کا علاج کر سکوں۔

سید زعیم عباس، لاہور

میری زندگی کا مقصد آرمی میں جا کر ملک و قوم کی خدمت کرنا ہے۔

محمد ضیاء اللہ عادل، پشاور

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا تاکہ بیماروں کا علاج کر سکوں۔

محمد عبدالرحمن ظفر، کراچی

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔

محمد امین اسلم، کرم ایجنسی

میری زندگی کا مقصد عالم دین بن کر ملتِ اسلامیہ کی خدمت کرنا ہے۔

وردہ فاطمہ عباسی، بلیک سٹی

میری زندگی کا مقصد اسلام کو دنیا کے چپے چپے میں پھیلانا ہے۔

حافظ حق نواز، سرگودھا

میں بڑا ہو کر نیک انسان بنوں گا اور ملک کی خدمت کروں گا۔

ثاقب گل فراز، راول پنڈی

میں پائلٹ بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

بخت نصر، راول پنڈی

میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔ میں اس کے لئے محنت کر رہا ہوں۔

علی حیدر لاہوری، لاہور

میں اپنے محلے میں فری ڈسپنسری کھولوں گا۔ جہاں غریب لوگوں کا مفت علاج کروں گا۔

عاطف فراز، تلہ گنگ

میں انجینئر بننا چاہتا ہوں اور ایک اچھا انسان بن کر ملک کی ترقی کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔

عیسیٰ لیاقت، لاہور

میں انجینئر بن کر ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لوں گا۔ ان شاء اللہ۔

میری زندگی کے مقاصد کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ..... شہر .....

مقاصد .....

.....

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 فروری 2010ء ہے۔

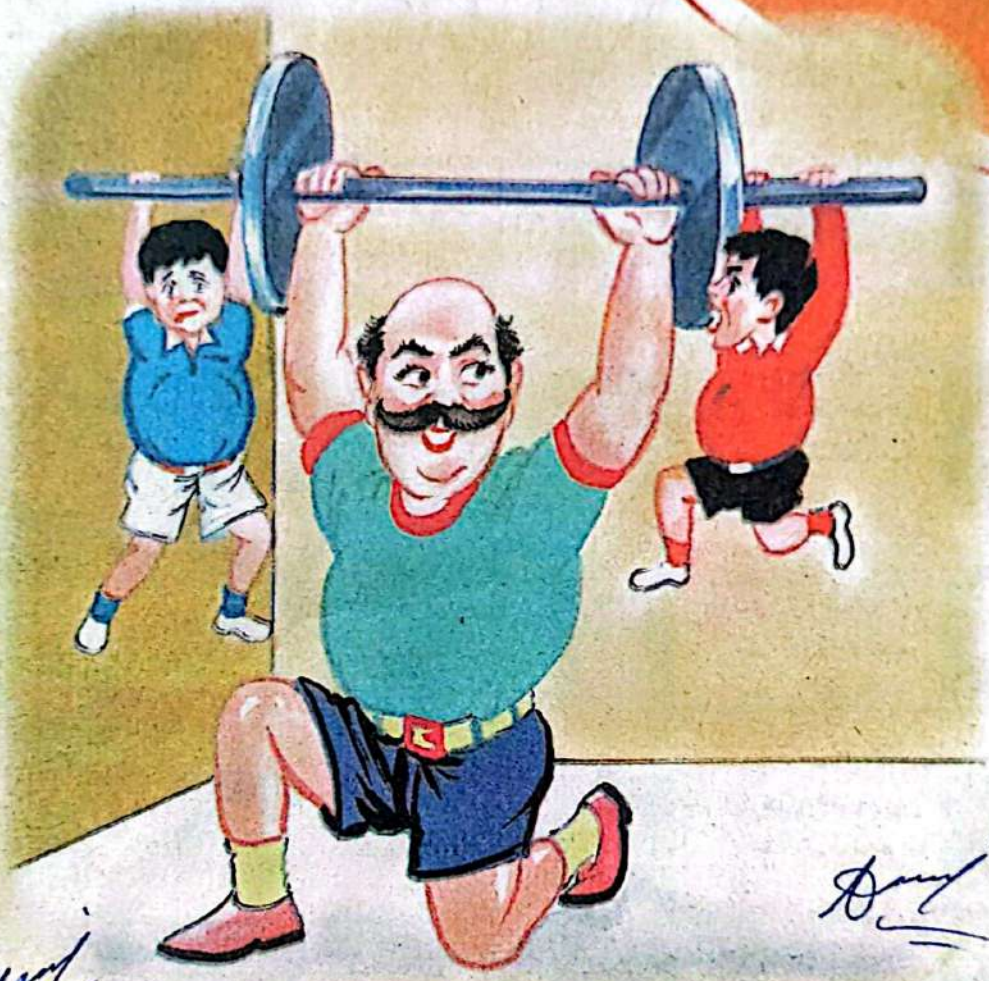

جنوری 2010ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے ہزاروں عنوانات موصول ہوئے، جن میں سے مجلسِ ادارت کو 200 عنوانات پسند آئے اور یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی کتب کے انعامات کے حق دار قرار پائے۔

☆ اقصیٰ بتول، فیصل آباد (پتنگ کی لوٹ ..... بذریعہ پیراشوٹ)

☆ طوبیٰ صدیقی، کراچی (ہوا باز بنے پتنگ باز)

☆ شاہ زیب اصغر، اسلام آباد (ہوائی پتنگ لٹیرے)

☆ عروسہ اویس، کراچی (یہ ہے پتنگ لوٹنے کا صحیح طریقہ)

☆ حفصہ رزاق، اسلام آباد (کٹی پتنگ، شروع ہوئی جنگ)

باقی عنوانات اندر ملاحظہ کریں

Shezan
MIXED FRUIT
JAM
MANGO
JAM
APPLE
JAM
SWEET ORANGE
MARMALADE
جیسا پھل ویسا مزہ!

Lots & Lots Of ENERGY With Lots & Lots Of...

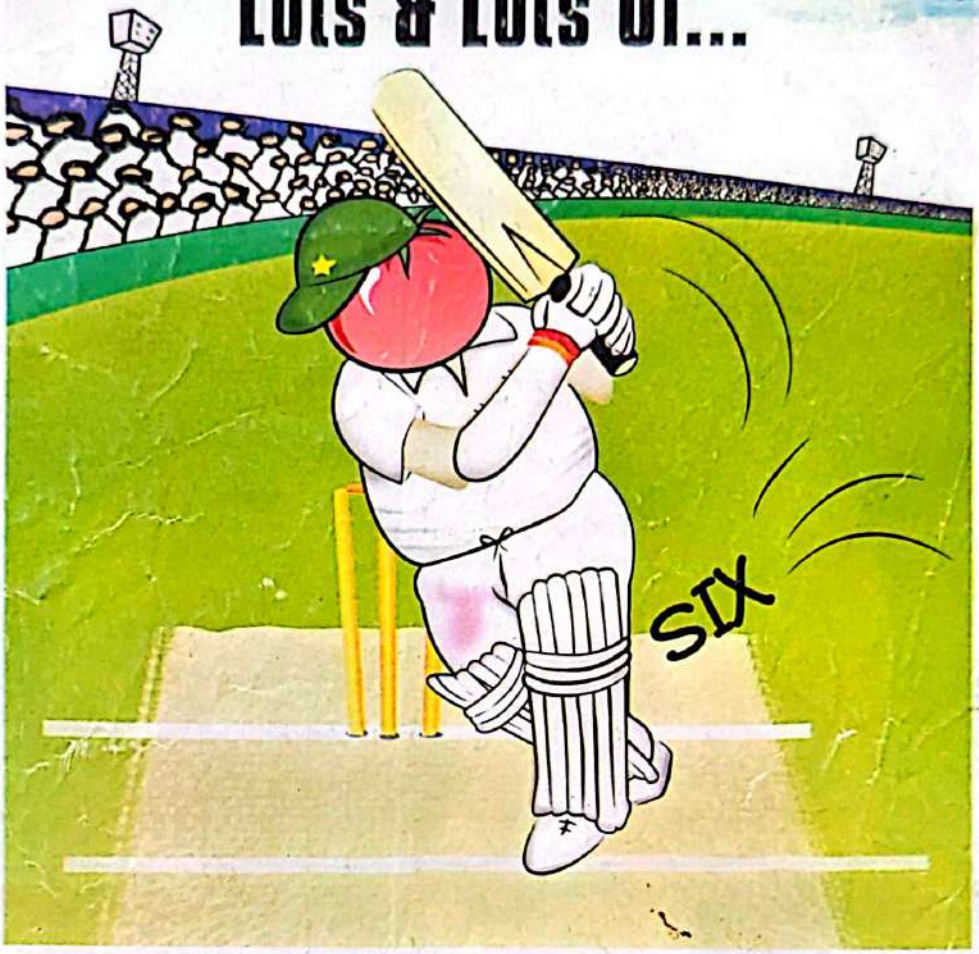

Tomato Ketchup

Consumer Choice Award
For 2005, 2006, 2007 & 2008

Shangrila®

Takes the Taste...
...to the Limits

Pakistan's First Company Awarded HALAAL Certification By South African National Halaal Authority

ISO 9001:2000 Certified

Member
The Association for DRESSINGS & SAUCES, USA

www.shangrila.com.pk